بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# تحریک ادب

شمارہ،88اپریل-2025 جلدنمبر18

Tahreek-e-adab vol-18, issue-88 April 2025

مدیر Editor

جاویدانور(ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

**مجلس ادارت**

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم،سابق صدر شعبہ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک،سابق صدر شعبہ اردو،جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم،صدر شعبہ عربی،باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان،صدر،شعبہ کشمیری،کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی(سابق صدر،شعبہ اردو،مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی،وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد،صدر شعبہ اردو،مولانا آزاد پی۔جی۔کالج،کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن،شعبہ اردو،بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

## مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad ( General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Vol-18(جلد نمبر 18) Year of Publication 2025

شمارہ نمبر : شمارہ 88،اپریل، Issue April 2025

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زر سالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زرِ رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through

cheque,draft or internet banking on the following:
Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087
State Bank Of India,Branch-Shopping
centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارانسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرا ردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

# فہرست

1۔فخر زماں، بنٹے آنن کی ہیر:امریتا پریتم
(میں زندہ آدمی ہوں کی آخری قسط) خالد حسین 5
2۔افسانوی مجموعہ" ابابیلیں اب نہیں آئیں گی":ایک تجزیاتی مطالعہ محمد فرید 24
3۔قومی یکجہتی اور میں گوجری زبان کا کردار محمد فرید 31
4۔ پنڈت پریم ناتھ پردیسی اور ریاستی اردوافسانہ سریش کمار 36
5۔قومی یکجہتی بچ پہاڑی زبان وادب نا کردار ڈاکٹر ساجد منیر 40
6۔پہاڑی زبان نا آغاز تہ ارتقا:ایک سرسری جائزہ ڈاکٹر ساجد منیر 46
7۔نثار راہی نا افسانہ" سانجھالہو" نا تجزیہ جہانگیر الحق خاں 50
8۔عصمت چغتائی اور ریڈیائی ڈرامہ محمد یوسف میر 55

**افسانے**

1۔داستان محبت کا آخری سین نور شاہ 58
2۔اندر کی بات نور شاہ 62
3۔انوکھا گاہک وحشی سعید 65
4۔آب وحشی سعید 68

**افسانچے**

1۔سرِ الٰہی، ہٹ دھرم، بلاعنوان، شرمندگی، سوچ
خود دار، ترجیح ڈاکٹر نذیر مشتاق 73

**افسانہ**

1۔شکار وفا نقوی 77
خبر۔پروفیسر شاہینہ رضوی کی کتاب" تجربات زیست کی رسم اجرا 84

**ہندی**

1۔نویں صدی میں دکشن بھارت کا راجنیتک اتہاس ثمیر حسن عادل 85

Fakhr-e-Zaman, bante Aangan ki Heer ....Amrita Pritam (Main Zinda Admi hoon,Completed) by Kahlid Hussain (Rtd. D.C.)Jammu. cell- 7006898585

خالد حسین (جموں)

# فخر زماں

فخر زماں صاحب کو میں نے سب سے پہلے لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''پنج دریا'' میں پڑھا۔ ''پنج دریا'' کے ایک خصوصی شمارے میں فخر زمان کی دو غزلیں چھپی تھیں جن کے دو اشعار آج بھی مجھے زبانی یاد ہیں کیونکہ یہ دونوں اشعار ہندوستان اور پاکستان کے گرد آلود تعلقات کی نشاندہی کرتے تھے۔

''یا تاں بدل رجّ کے وسّے یا مُڑ سورج لشکے
مٹی گھٹے دا ایہہ موسم کِنوں چنگا لگ دا
(ترجمہ) یا تو بادل خوب برسے یا پھر سورج چمکے
گرد و غبار والا موسم کس کو اچھا لگتا ہے

''سانوں ڈاڈھا لوڑی دا اے اج اِک دُلا بھٹّی ہور
بھنے کینگرے دِلّی دے تے بھا جڑ پاوے تخت لاہور''
(ترجمہ) ہمیں آج شدّت سے ضرورت ہے ایک اور دُلاّ بھٹی کی
جو دِلّی کے منارے توڑ دے اور تخت لاہور کو لرزا دے

پھر یہ شاید 1981-82 کی بات ہے کہ پاکستانی پنجاب سے جو پنجابی ادیب جالندھر میں عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے آئے تھے، ان میں پروفیسر شہباز ملک (پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پنجابی شعبہ کے صدر) شاعر اور نقاد انور بیگ اعوان اور ''پنج دریا'' کے مدیر امجد بھٹی بھی تھے جنہوں نے ''فخر زمان نمبر چھپا تھا اور جس میں فخر زمان کے دو شعری مجموعوں ''کنسو ویلے دی'' اور ''ونگار'' سے نظمیں بھی لی گئی تھیں، اور اُن کی نجی اور ادبی زندگی کے بارے میں مضامین بھی تھے۔ اُن کی نظموں میں غریب، نادار اور غلام قوموں کی ترجمانی کی گئی تھی۔ شاعری کے ذریعے علامتوں اور استعاروں میں فوجی حکومت کے جبر، دہشت اور سیاست کے المیے کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر فخر زماں

صاحب کا پہلا ناول ''ست گواچے لوک'' پڑھنے کو ملا۔ یہ ناول پنجابی ناول نگاری میں ایک Trend Settler تھا۔ اسی شیلی میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول '' پکھیرو'' بھی شائع ہوا تھا۔ یہ دونوں ناول مشرقی پنجاب میں گورمکھی رسم الخط میں شائع کیئے گئے اور پنجاب اور دہلی کی یونیورسٹی کے نصاب کا حصہ بنے۔ ''ست گواچے لوک'' کی شہرت کا ثبوت یہ تھا کہ ہر ادبی محفل میں اس ناول کا ذکر ہوتا اور اُس پر تبصرہ کیا جاتا۔ پھر فخر زماں کا دوسرا ناول 'اک مرے بندے دی کہانی'' شائع ہوا۔ ''ست گواچے لوک'' پنجاب کی سرزمین، ثقافت اور تاریخ کی کہانی ہے، جس میں ''سات گم شدہ لوگ'' اپنی اپنی کہانی سُناتے ہیں اور سماج کی خامیوں اور عوام کے دُکھ، درد، استحصال اور ظلم، زیادتی کو بیان کرتے ہیں۔ جب کہ ''اِک مرے بندے دی کہانی'' انسانوں کے دوغلے پن کی کہانی ہے۔ فخر زمان پیپلز پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے اور وہ رُکن اسمبلی بھی رہے۔ جب اُن کی سرکار کا تختہ پلٹ کر جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی تو ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھیوں کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ جن میں فخر زمان بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے جیل میں اپنا تیسرا ناول ''بندی وان'' یعنی ''قیدی'' لکھا۔ یہ ناول جیل سے سمگل ہو کر مشرق پنجاب میں 1981ء میں گورمکھی رسم الخط میں چھپا جبکہ شاہ مکھی یا اُردو رسم الخط میں یہ ناول لاہور سے 1984ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول جنرل ضیاء الحق کے فوجی راج، وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور لوگوں کے ردِعمل کی کہانی ہے۔ فوجی راج کی دہشت کی داستان ہے اس ناول کا مرکزی کردار ''زیڈ'' شہید بھٹو کا عکس ہے میں نے اس ناول کو پڑھنے اور اس سے متاثر ہو کر ایک کہانی '' کلاوڈ برسٹ'' لکھی تھی اور استعاروں اور علامتوں کے ذریعے وہی بات کہی تھی جو فخر زمان نے اپنے ناول میں تفصیل کے ساتھ بیان کی تھی۔ اس کے بعد فخر زمان صاحب نے کئی اور ناول لکھے۔ ''ہے وطنا''، ''کم ذات''، ''توکہ میں'' جیسے ناولوں کو پنجابی دُنیا نے گلے لگایا۔ پڑھنے کے بعد بے شمار تنقیدی مضامین لکھے۔ فخر زمان کے ناولوں میں پنجاب، پنجابی اور پنچایت کی جڑیں اپنی زمین میں گہرائی تک پیوستہ ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر پنجابیوں کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کا شیدائی ہے۔ اُسے اپنے ماضی پر فخر ہے۔ وہ ہڑپہ، ٹیکشلا اور گندھارا، تہذیب کو پنجابیوں کا عروج سمجھتا ہے۔ اُس نے کبھی ہندو اور مسلمان کی عینک سے تاریخ کو نہیں دیکھا۔ اُس کا ہیرو، راجہ پورس ہے۔ دُلا بھٹی ہے احمد خان کھرل اور بھگت سنگھ ہے۔ وہ غوری اور غزنوی کو حملہ آور کہتا ہے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ دُرانی کو ظالم کہتا ہے۔ جنہوں نے پنجابیوں کے سینے چھلنی کیئے، اور اُن کی لاشوں پر گزر کر دلّی پر قابض ہوئے۔ اُس کے ناولوں میں پنجاب کا اتہاس ملتا ہے۔ چاہے وہ دراوڑوں یا آریاؤں کے زمانے کا ہو یا

چاہے ہندوستان کی تقسیم کے بعد کا ہو۔ وہ بھارت پاکستان کی بداعتمادی، بے یقینی اور دشمنی اور سرحدوں پر کانٹے دار تار کو علامت کے طور پر اپنے ناولوں میں استعمال کرتا ہے۔ ''تُوں کہ میں'' ایک علامتی اور تمثیلی ناول ہے۔ جس میں پنجاب کی تقسیم کا المیہ ہے۔ فخر زمان پنجاب کے ضلع گجرات کا جٹ ہے اور اس جٹ نے اس ناول میں صوفیوں کے کلام کے ذریعے کہانی کو منطقی انجام تک پہنچایا ہے۔ بابا فریدؒ، بابا نانک، شاہ حسین، وارث شاہ، سلطان باہُو، بُلّھے شاہ اور میاں محمد بخش جیسے کامل صوفی درویشوں کے کلام کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کے منظر نامے میں پنجاب کی عشقیہ داستانیں، پانچ دریاؤں کے پانیوں کا جلترنگ اور لوک ورثہ کے حوالے نے ناول کو ایک دستاویز بنا دیا ہے۔

فخر زمان ترقی پسند خیالات اور کھلے پن کا حامی ہے۔ اور سماجی بندشوں کے خلاف۔ وہ انسان دوستی، امن، سچائی اور جیتی جاگتی اور ہنستی کھیلتی زندگی کا ادیب ہے۔ وہ بیگم نصرت بھٹو کا پولیٹیکل ایڈوائزر رہا۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد (Accademy of Letters) کا چیئرمین رہا۔ سینٹر رہا۔ وفاقی وزیر رہا اور نیشنل کمیشن آف ہسٹری اینڈ کلچر کا چیئرمین بھی رہا اور آجکل وہ عالمی پنجابی کانگریس کا چیئرمین ہے۔ میری اُس سے روبرو ملاقات 2004ء میں واہگہ بارڈر پر ہوئی جب بھارتی پنجابی ادیبوں اور فنکاروں کے استقبال کے لئے وہ وہاں آیا تھا۔ اُس نے میرا نام سنتے ہی مجھے گلے سے لگایا۔ پھولوں کا ہار پہنایا۔ باقی ادیبوں سے بھی وہ فرداً فرداً ملا اور اُن کا سواگت کیا۔ عالمی پنجابی کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے اُس کے ساتھیوں نے انتھک محنت کی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ پاکستانی پنجاب میں چھپنے والے رسائل میں اُس نے میری کہانیاں پڑھی ہیں اور مشورہ دیا کہ میں شاہ مکھی رسم الخط میں اپنی کہانیوں کا ایک انتخاب شائع کروں تا کہ میری کہانیاں ادب نواز لوگ پڑھ سکیں میں نے اُس سے گزارش کی کہ اگر وہ شاہ مکھی رسم الخط والی کتاب کا پیش لفظ لکھ دے تو وہ جلد کتاب چھاپ دے گا۔ اُس نے حامی بھر لی اور میں نے جموں آکر کہانیوں کا مسودہ ڈاک کے ذریعے فخر زماں کو بھیج دیا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اُس نے پیش لفظ لکھا اور بھیج دیا۔ کتاب چھپی اور اُس کا عنوان ''بلدی برف دا سیک'' ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرا 2005ء میں لاہور کے الحمرہ ایڈیٹوریم میں ہوئی۔ بعد ازاں یہی کتاب گورمکھی میں لدھیانہ سے چیتنا پرکاشن والوں نے چھاپی۔ اس کتاب کی کہانیاں دِلی، جموں اور پنجاب کی تقریباً سبھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئیں۔
اُسی سال موسم سرما میں چنڈی گڑھ میں عالمی پنجابی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں پاکستانی وفد کی سربراہی فخر زمان نے کی لیکن وہ دوسرے دن ہی واپس لاہور چلا گیا جہاں اُس کی بیگم اور مشہور شاعرہ

شائستہ حبیب کینسر کی وجہ سے اپنی آخری سانس لے رہی تھی کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے جواب دے دیا تھا۔ چند دنوں بعد اُس کی شریکِ حیات وفات پا گئی ۔ 2007ء میں جب فخر زمان پٹیالہ میں پنجابی یونیورسٹی کی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے آیا تو میں نے اُسے جموں آنے کی دعوت دی جو اُس نے قبول کرلی اور پھر ایک دن دلّی سے اُس کا فون آیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جموں آرہا ہے شائستہ حبیب کی وفات کے بعد اُس نے دلی یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی پروفیسر سے نکاح کرلیا تھا۔ جموں میں وہ میاں بیوی میرے غریب خانے بٹھنڈی میں ٹھہرے ۔اُس کے اعزاز میں جموں یونیورسٹی نے ایک پروگرام منعقد کیا جس کی صدارت وائس چانسلر امیتابھ مٹو نے کی اور جس میں یونیورسٹی اساتذہ کے علاوہ جموں کے ادیب، شاعر، دانشور اور صحافیوں نے شرکت کی ۔فخر زماں نے پاکستان میں لکھے جارہے انگریزی اور مقامی زبانوں کے ادب کے بارے میں گفتگو کی ۔ پاکستان اور ہندوستان کے رشتوں کے بارے میں تفصیل سے اپنا نقطہ نظر رکھا اور حاضرین کے پوچھے گئے سوالوں کے جوابات بھی دیئے۔شام کو پنجابی ادبی سنگت کی طرف سے جموں پریس کلب میں ایک ادبی نشست سجائی گئی جس میں باہمی بات چیت کے علاوہ شعروشاعری کا دلچسپ دور چلا۔ جب 2011ء میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو فخر زماں نے مجھے ظہرانے پر بُلایا۔ جہاں پُرانی یادیں تازہ کی گئیں اور جشن فیض سے متعلق اُس نے مجھے مفید مشورے دیئے اور اُستاد حامد علی خان کو جموں بُلانے کی بات کہی۔

فخر زماں ایک ادارے کا نام ہے ۔ایک نامور پنجابی ناول نگار ایک شاعر، جس کو ادبی خدمات کے صلے میں پاکستان کی سرکار نے 1994ء میں ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔ کئی غیر ملکی انعامات ملے ۔2001ء میں پنجابی ناول نگاری کے حوالے سے میلینیم ایوارڈ ملا۔ وہ پنجابی زبان وادب اور پنجابیت کا سفیر ہے اور مجھے فخر ہے کہ مجھے بھی فخر زمان جیسی مقناطیسی شخصیت کا قُرب حاصل ہے۔اللہ اُسے صحت کامل عطا کرے۔

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم ،فسانہ ہیں، ہم لوگ (منتظر لکھنوی)

**ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری گجراتی:**

ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری سے میری پہلی ملاقات 2004ء میں لاہور کے ''الحمرۂ'' کلچرل سنٹر میں ہوئی۔ میں بھی بھارتی پنجابی ادیبوں کے اُس ڈیلی گیشن میں شامل تھا جو عالمی پنجابی کانفرنس

میں حصہ لینے کے لئے لاہور گیا تھا۔ کانفرنس کی پہلی شام گیت سنگیت کا پروگرام سننے کے لئے ''الحمرہ'' ایڈیٹوریم میں بھارتی وفد کے ساتھ میں بھی بیٹھا تھا۔ وہاں ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری نے سٹیج پر دو پنجابی گیت گائے۔ جن میں سے ایک عظیم پنجابی شاعر موہن سنگھ ماہرؔ کا لکھا ہوا تھا۔ اس دلچسپ پروگرام میں پاکستان کے نامی گرامی گلوکاروں نے بہترین نغمے پیش کئے۔ اُستاد حامد علی خان، اقبال باہو، شوکت علی، شفقت علی خان، حامد علی بیلا کے فرزند اور فیویژن گروپ نے اپنا اپنا کمال دکھایا۔ مشرقی پنجاب سے پمی بھائی اور اُس کے گروپ نے پنجابی لوک ناچوں کے مختلف اقسام کی جھلک پیش کی۔ دوسرے دن کانفرنس ہال میں منتظمین نے میرا تعارف ڈاکٹر اظہر محمود سے کرایا اور کچھ پلوں میں ہی اس کے خلوص، ملن سار طبیعت اور ہنس مکھ چہرے نے مجھے اُس کا گرویدہ بنا دیا۔ میں نے اُسے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ دیا۔ اُس نے میری کچھ کہانیاں پاکستانی میگزینوں میں پڑھی تھیں۔ وہ پنجابی ادب کا ایک سنجیدہ قاری تھا۔ اُس نے صوفیوں کے کلام کے علاوہ موہن سنگھ ماہرؔ، امرتا پریتم، شوکمار بٹالوی، سُرجیت پاتر اور کئی دوسرے شاعروں اور ادیبوں کو پڑھا تھا۔ اُسے شاعروں کا کافی کلام زبانی یاد تھا۔ ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کھلے ذہن ودل کا مالک ہے اور زمین کے ساتھ جڑا ہوا ایک زندہ دِل انسان۔ وہ پیشے سے ڈاکٹر ہے اور Skin Specialist یعنی امراض جلد کا ماہر اور گجرات کے ضلع ہسپتال کا سپرنٹنڈنٹ۔ گجرات میں بھمبر روڈ پر اُس کا ایک بڑا کلینک ہے۔ کلینک کے بیس منٹ میں اُس نے گلوکاروں، ادیبوں اور شاعروں کے لئے خصوصی جگہ بنائی ہے۔ وہ بعد دوپہر چار بجے سے رات آٹھ بجے تک مریضوں کو دیکھتا ہے اور پھر آٹھ بجے سے رات گیارہ بجے تک روح کی خوراک حاصل کرنے کے لئے بیس منٹ میں آجاتا ہے جہاں ادیب، شاعر اور فنکار اُس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور علم وفن کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ سنگیت کار اور گائک سُر اور تال کی باریکیاں سمجھاتے ہیں دو سال بعد ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے پٹیالہ آیا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ دو دِن ہم ایک ساتھ رہے اور خوب گپ شپ ہوئی۔ دوستی کے مشروب پیئے گئے۔ ''وارث بھون'' پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ ادیبوں اور فنکاروں کے لئے ایک تیرتھ ستھان ہے جہاں ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے آرٹسٹ آپس میں ملتے ہیں اور دُنیا ئے ادب کے معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ تیسرے دِن ظہرانے پر میں نے سُرجیت پاتر کو ڈاکٹر اظہر محمود سے ملایا۔ سُرجیت پاتر نے اپنا گیت '' کچ دا گلاس'' ترنم میں سنایا۔ ڈاکٹر اظہر محمود نے اُسے لکھ لیا۔ کانفرنس ختم ہونے پر میں پاکستانی مہمانوں کے ساتھ ہی امرتسر تک گیا اور پھر وہاں سے جموں

چلا آیا لیکن ڈاکٹر چوہدری سے ٹیلیفوں اور چٹھیوں کے ذریعے میرا رابطہ بنا رہا۔ایک دِن مجھے ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کا دلّی سے ٹیلیفون آیا۔ وہ وہاں سارک ہیلتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کل شام دِلّی سے امرتسر پہنچ رہا ہے اور وہاں گورونانک دیو یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے گا لہٰذا اُس نے مجھے بھی امرتسر بلایا تھا تا کہ ملاقات ہوسکے اور رات اکٹھی گزار سکیں۔دوسرے دِن میں امرتسر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔گرمجوشی سے ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔اُس کے ساتھ نامور پاکستانی گائک اور سلطان باہوؔ کے کلام کوامر بنانے والا محمد اقبال بھی تھا جو حبیب بنک میں منیجر تھا لیکن سلطان باہُو کا کلام گانے کی وجہ سے اقبال باہُو کے نام سے مشہور ہوا۔رات گیارہ بجے کے قریب اظہر محمود مجھے کہنے لگا کہ یونیورسٹی سے باہر چلتے ہیں اور کسی ڈھابے پر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔میں اُن دونوں کو لیکر تیلی گھر کے ایک ٹی سٹال پر لے گیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ڈاکٹر اظہر محمود نے مجھے بتایا کہ اُس نے سُرجیت پاتر کے گیت ’’کچ دا گلاس‘‘ کی دُھن بنائی ہے اور گایا بھی ہے۔میرے گیتوں کی نئی کیسٹ تیار ہے۔ایک آدھ مہینے تک مارکٹ میں آجائے گی لیکن میرے لئے وہ اُس کیسٹ کی ڈمی لیکر آیا ہے۔پھر اُس نے وہ گیت گانا شروع کیا۔تھالی اُس نے پکڑ لی اور اقبال باہُو نے جگ۔دونوں تھالی اور جگ بجانے لگے اور سُرجیت پاتر کا گیت اُبھرنے لگا
۔

اج میرے کولوں کچ دا گلاس ٹٹیا
تے میری امنبٹری نے
میری امنبٹری نے دِتیاں نیں لکھ جھڑکاں
تے میرے نیناں وچوں چھم چھم نیر پھٹیا
تے میرے نیناں وچوں
میری امنبٹر یئے ،مینوں اک گل دس دے
لوکی دِل توڑ دیندے نیں تے کِداں ہس دے‘‘

گیت کی دُھن غضب کی تھی اور اُس نے گایا بھی خوب تھا۔ٹی سٹال پر لوگ اکٹھا ہونے شروع ہوگئے۔پھر اُس نے پنجاب کا لوک گیت ’’جگا‘‘ گایا۔میری فرمائش پر اقبال باہُو نے سلطان باہُو کے کلام کا ایک ٹکڑا گایا پھر وارث شاہ کی ہیر کا ایک بند گا کر سنایا۔بھیڑ بہت زیادہ ہوگئی تھی اور لوگ فرمائشیں کرتے جارہے تھے۔لیکن رات کے دو بج چکے تھے لہٰذا ہم واپس گیسٹ ہاؤس آگئے

اور ساری رات باتیں کرنے میں گزاری۔ صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور پھر میں اُن دونوں کو اپنی کار میں واہگہ بارڈر چھوڑ کر جموں چلا آیا۔ اقبال باہُو کوئی پیشہ ور گائک نہیں تھا اور نہ ہی ڈاکٹر اظہر محمود دونوں شوقیہ گاتے تھے۔ اقبال باہو نے حضرت سلطان باہُو کے علاوہ ''سیف الملوک میاں محمد بخش'' ، ''ہیر وارث شاہ'' شاہ حسین اور بُلھے شاہ کا کلام بھی گایا ہے اور اُردو غزلیں بھی۔ افسوس کہ کچھ مہینے پہلے پاکستان سے خبر آئی کہ اقبال باہُو فوت ہو گئے۔

اکتوبر 2011ء کو جب میں نے ایک رشتے دار کے بیٹے کی شادی میں حصہ لینے اور جشن فیض احمد فیض کے پروگرام کے سلسلے میں پاکستانی مہمانوں کو دعوت نامے دینے گیا تھا تو میں نے ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کو گجرات فون کیا اور اپنی آمد کی اطلاع دی اور اُسے بتایا کہ عید کے دوسرے دن وہ واپس جموں جا رہا ہے۔ تو اُسی روز شام چھ بجے وہ خالہ رضیہ کے گھر گلبرگ پہنچ گیا۔ اُس نے میری خالہ، بھائی زاہد، اس کی بیگم سے ملاقات کی اور پھر مجھے لیکر لاہور کے مشہور ریسٹورنٹ ''ولیج'' لے گیا۔ اُس کا کزن (ماموں زاد) بھی اُس کے ساتھ تھا۔ وہاں خالص پنجابی پکوان پروسے گئے اور ہم رات بارہ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ اُس کا بھائی بڑی رنگین طبیعت کا مالک تھا اور لفظوں کا جادوگر۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ چھ سات گھنٹے کیسے بیت گئے اور پھر دیر رات وہ واپس گجرات چلا گیا جہاں عید اُس نے اپنے آبائی گاؤں میں اپنے والد کے ساتھ منانی تھی۔ اس سے پہلے جب میں 2005ء میں گجرات اُس کو ملنے گیا تھا تو وہ تاریخی مقامات دکھانے لے گیا تھا جہاں پورس اور سکندر کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور چیلیاں کا وہ میدان بھی جہاں انگریزوں نے سکھ فوج کو شکست فاش دی تھی اور پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ گجرات وہ جگہ ہے جہاں ہندو دھرم کے کئی گرنتھ لکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر اظہر محمود یاروں کا یار ہے۔ کاش ہماری سرکاریں ویزا سسٹم میں نرمی کریں اور وہ میرے پاس جموں آئے اور مجھے خدمت کا موقع بخشے۔ یہاں یہ بات بتانی دلچسپی کا باعث ہو گی کہ گجرات کے چودہ گاؤں جموں کی سرحد کے ساتھ ملتے ہیں اور دریائے چناب کا ہیڈ مرالہ (گجرات) اکھنور سے چند کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ جب میں 2019ء میں بابا نانک امن کانفرنس کے لئے لاہور آیا تو ڈاکٹر اظہر محمود نے مجھے بتایا کہ اُس نے پنجابی ادب میں پی ایچ۔ ڈی کی ہے۔ مقالے کا عنوان تھا ''پنجابی الفاظ واصطلاحات نگاری کا تقابلی جائزہ'' Contribution to Punjabi Lexicography with reference to H.A. Rose یہ تحقیقی مقالہ انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرانی کی نگرانی میں مکمل کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

حاصل کی تھی۔اس سے پہلے اُس نے پنجابی میں ایم۔اے کیا تھا۔ایک میڈیکل سند یافتہ اور ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کر کے جلد کی بیماریوں کا معالج پنجابی میں پی ایچ۔ڈی کرے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری پنجابی زبان وثقافت کا عاشق ہے۔اللہ میرے دوست کو صحت مند زندگی عطا کرے۔

لکھ ہزار بہار حسن دی خاکو وچ سمانی
لا پریت محمد جس تھیں جگ وچ رہے کہانی (میاں محمد بخش)
(ترجمہ) چاہے حسن کی بہار لاکھ گنا ہو پھر بھی مٹی میں سمانی ہے
اس لئے ایسی پریت لگا محمد کہ دُنیا میں تمہاری کہانی زندہ رہے

**افضل ساحرؔ:**

افضل ساحرؔ ذہن ودِل کا خوبصورت اور محبتیں بانٹنے والا پنجابی شاعر ہے۔اُسے پنجابی الفاظ کی تہذیب اور اُن کو استعمال کرنے کا فن آتا ہے۔اُس کی زبان خالص ''ماجھی'' (پنجابی کی تیسری بڑی ڈائیلٹ۔پہلی لہندی یا ملتانی، دوسری پوٹھواری، چوتھی دوآبی اور پانچویں ملّوئی۔اس کے علاوہ ساٹھ Sub dialects ہیں) اور تخیّل بے مثال۔وہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں ایک جیسا مقبول پنجابی شاعر ہے۔اُستاد دامن اور بابا نجمی کی طرح اُس کے چاہنے والے پنجاب کے دونوں اطراف بے شمار ہیں۔دُنیا کے کونے کونے میں بسنے والے پنجابی اُس کے گیت سُن کر جھومتے ہیں۔اُس کے لکھے گیت کوک اسٹڈیو، پاکستان ٹیلی ویژن اور فلموں میں لئے گئے ہیں اُس کے گیت راحت فتح علی خان، شفقت امانت علی، ساحر علی بگّا اور کئی دوسرے گلوکاروں نے گائے۔''شکر ونڈاں'' گیت نے تو پورے پنجابی جگت میں تہلکہ مچا دیا ہے۔افضل ساحرؔ پنجابی شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔اُس کی نظمیں، گیت اور دوہے زندگی کی سچائی کی عکاسی کرتے ہیں۔اُس کی تخلیق کا اصل سرچشمہ اُس کی زندگی کا تجربہ ہے۔اُس کے گیتوں میں کومل جذبے جہاں من مندر کی آرتی اُتارتے ہیں۔وہاں گیتوں میں ندی کا نرمل سنگیت بھی بہتا نظر آتا ہے۔اُس کی شاعری میں ٹھیٹھ پنجابی لفاظی اور دیہاتی بھاشائی لہجہ اُس کی پہچان ہے۔ملک کی تقسیم کا درد اُس کی نظموں میں جا بجا ملتا ہے۔میں نے اُس کی شاعری کی کتاب ''نال سجن دے رہیئے'' کو گورمکھی رسم الخط میں لکھ کر اپنے پبلشر چیتنا پرکاش لدھیانہ سے شائع کروایا۔2004ء میں ہماری ملاقات نے ہمیں دوستی کے مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔2005ء میں جب میری پنجابی کہانیوں (شاہ مکھی رسم الخط میں) کی کتاب کی رسم رونمائی ہوئی تو

اُس پروگرام کی نظامت افضل ساحرؔ نے ہی کی تھی۔شام کو افضل ساحرؔ مجھے ایف۔ایم 103 لاہور کے ریڈیو اسٹیشن لے گیا اور ''فوج میلہ'' پروگرام میں میرا ایک طویل انٹرویو لیا۔انٹرویو ختم ہوتے ہی چائے منگوائی گئی۔چائے کا دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ ریکارڈنگ انجینئر میرے انٹرویو کی سی۔ڈی بھی لے کے آ گیا۔افضل ساحرؔ جہاں سب کا پسندیدہ شاعر ہے وہاں وہ ایک بہترین اینکر بھی ہے۔مشاعروں میں نظامت کے فرائض بھی نبھاتا ہے اور پنجابی زبان کو سکولوں میں پرائمری سطح سے لاگو کرنے کی جدوجہد میں وہ ہراول دستے کا سالار بھی ہے۔2011ء میں اُس نے میرا ریڈیو لاہور کے لئے دوبارہ انٹرویو لیا۔انٹرویو کے دوران ہی میں نے اپنا افسانہ ''اِک مرے بندے دی کہانی'' پڑھا تو افسانے پر تبصرے ٹیلیفون کے ذریعے آنے لگے۔سننے والوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق افسانے کو سراہا بھی تھا اور منفی رائے بھی دی تھی۔میری ادبی زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ افسانہ پڑھتے ہی ریڈیو پر سامعین اپنی رائے سے نوازیں۔یہ ایک خوش نما تجربہ تھا۔اس انٹرویو کی سی۔ڈی بھی میرے پاس ہے۔دوسرے دن وہ مجھے باغِ جناح لاہور کے کلب میں لے گیا جہاں مشہور افسانہ نگار انتظار حسین کی صدارت میں محفل افسانہ کا انعقاد ہوا تھا۔وہاں میں نے اُردو افسانہ ''ستی سرکا سورج'' پڑھا۔اِس سے پہلے بھی مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں نے علی سردار جعفری اور خواجہ احمد عباس کی صدارت میں 1973ء اور 1978ء میں افسانے پڑھے تھے۔وہاں سے فارغ ہو کر ہم دونوں سر گنگا رام چوک میں ''پنچم'' کے دفتر گئے۔جہاں ماہنامہ ''پنچم'' کے مدیر مسعود ثاقب نے مجھے کئی کتابیں اور پنچم کے شمارے دیئے۔جمیل احمد پال سے ملے جو 'انٹرنیشنل سویز'' کا مدیر ہے دن کا کھانا میں نے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار (وارث،سمندر،جانگلوس وغیرہ) امجد اسلام امجد کے ساتھ کھایا جس میں ایوب خاور اور طاہر سرور میر نے بھی شمولیت فرمائی۔اُن کو بھی امجدؔ صاحب نے دعوت دے رکھی تھی۔اگلے دِن افضل ساحرؔ مجھے بین الاقوامی شہرت یافتہ کتھک کلاکار اور مشہور ہالی وڈ اور ٹالی وڈ ایکٹر اور اینکر ضیا محی الدین کی اہلیہ ناہید صدیقی کے گھر لے گیا جہاں ہم رات کے کھانے کی دعوت پر مدعو تھے۔وہاں کراچی سے ایک ممتاز ستار نواز سے بھی ملے۔جنہوں نے اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کیا۔افضل ساحرؔ نے اپنی شاعری سے سب کو محظوظ کیا اور ناہید صدیقی نے ہمیں کتھک ڈانس کی باریکیاں سمجھائیں۔ناہید صدیقی کا گھر فنون لطیفہ کا ایک چھوٹا موٹا میوزیم لگتا ہے۔رات کے ایک بجے وہ محفل ختم ہوئی۔افضل ساحرؔ ہندوستانی پنجاب کے شاعروں،ادیبوں اور کلاکاروں کو تلاش کر کے اپنے اسٹڈیو لاتا ہے اور انکا انٹرویو کرتا ہے۔یہ اُس کا شوق بھی ہے اور روٹی روزی کا وسیلہ بھی۔اہل

لاہور اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ ہندوستان سے آنے والے دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کی مہمان نوازی کو وہ اپنی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ایک بار افضل ساحرؔ نے محترمہ رانو صاحبہ کو بتایا کہ جموں سے پنجابی ادیب خالد حسین آیا ہے تو اس نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت پر بُلا لیا اور کہا کہ اُس نے میری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔رانو صاحبہ کے سسر جموں کے محلے دلپتیاں سے ہجرت کر کے لاہور جا بسے تھے۔اُن کا نام پروفیسر محمد اسحاق قریشی تھا جو پرنس آف ویل کالج میں پڑھاتے تھے۔اُن کے بیٹے عثمان کے ساتھ محترمہ رانو صاحبہ کی شادی ہوئی ہے جن کا پورا نام انبساط رانو ہے۔انبساط رانو کی خوش دامن صاحبہ پاکستانی انتظام والے کشمیر کے صدر کے۔ایچ خورشید (خورشید حسن خورشید) کی سگی بہن تھیں جو صدر بننے سے پہلے قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے تھے۔یعنی محمد اسحاق قریشی اُن کے سگے بہنوئی تھے۔خورشید صاحب بھی کشمیر (آبی گزر، سرینگر) سے ہجرت کر کے 1947ء میں پاکستان چلے گئے تھے بلکہ شیخ صاحب نے ان کو زبر دستی پاکستان بھجوا دیا تھا۔جن دوست احباب کو انہوں نے اس موقع پر دعوت دی تھی اُن میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج جسٹس فواد حسن صاحب، ان کی اہلیہ اور تین بیٹیاں (جسٹس فواد حسن اور عثمان صاحب قریبی رشتے دار ہیں) اردو افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی صاحبزادی محترمہ نزہت صاحبہ اور عابدہ پروین صاحبہ کی شاگرد بھی حاضر تھی جس نے عابدہ پروین کے رنگ میں نغمے گائے۔نُزہت صاحبہ نے ترنم میں حبیب جالب کی ایک غزل اور مشہور نظم ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا'' سنائی۔جسٹس فواد صاحب کی بیگم اور بیٹیوں نے وارث شاہ کی ہیر کو ایک نئے کلاسیکی رنگ میں پیش کیا۔محترمہ رانو صاحبہ نے کشمیری پکوان خود بنائے تھے اور بڑے خلوص کے ساتھ مہمانوں کی خدمت میں پیش کئے۔میں جب بھی لاہور جاتا ہوں تو میری شامیں افضل ساحرؔ اور منیر ہوشیار پوریہ کے ساتھ گزرتی ہیں جو پنجابی ادب اور خاص کر صوفیوں اور گورو صاحبان کی بانی کا گیانی ہے اور گورو گرنتھ صاحب کے شلوک اور اُن کا مطلب فیس بُک پر ڈالتا رہتا ہے۔ وہ ہندوستان سے آئے مہمانوں کی بہت خدمت کرتا ہے اور اُنھیں اپنی کار میں خوب گھماتا ہے۔اُن کے ساتھ پورا پورا دن اور بعض اوقات شامیں بھی گزارتا ہے۔اسی لئے تو کہتے ہیں کہ:

''لاہور، لاہور ہی ہے۔'' اور ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔''

دل کی تختی پہ بھی آیات لکھی رہتی ہیں

وقت مل جائے تو اُن کی بھی تلاوت کرنا (لیاقت جعفری)

# بڑے آنگن کی ہیر......امرتا پریتم

یہ دنیا کہتی ہے کہ امرتا پریتم مرگئی......31/اکتوبر 2005ء کو۔ ہاں! وہی امرت کور جو گوجروانوالہ،(پاکستان) میں 3/اگست 1919ء کو پیدا ہوئی۔ جس نے آٹھ سال کی عمر میں پہلی نظم کہی۔ ہاں! وہی امرت کور، جس نے اپنے والد کرتار سنگھ ہتکاری سے شاعری کا پہلا سبق سیکھا اور ماں راج کور سے پنجابی کی گُڑتی (گُڑ یا شہد جو بچے کو پیدا ہوتے چٹایا جاتا ہے) لیکر پنجابی زبان کے ساتھ دُلار پایا۔ وہی امرت کور، جس نے سید وارث شاہ کو اپنا اُستاد اور بابا بُلھے شاہ کو اپنا مرشد مانا۔ جس نے سلطان باہوؒ، مادھو لال حسینؒ، غلام فریدؒ، پیلو، ہاشم، قادر یار اور میاں محمد بخش کو اپنی روح کے ماہیوال بنایا اور جن کے صوفیانہ کلام کی چادر اُوڑھ کر اُس نے ''پنج ند'' میں ڈبکی لگائی۔ وہی امرت کور، جو لاہور میں جوان ہوئی۔ انارکلی بازار کے دُکاندار پریتم سنگھ سے بیاہی گئی اور امرتا پریتم بن گئی۔ پھر دِلّی کے 25۔حوض خاص میں شہرت کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آسمان کو جاتی ہوئی آخری سیڑھی بھی چڑھ گئی اور اپنے ازلی گھر چلی گئی۔ اِمروز کو اکیلا چھوڑ کر............کندلاں، اور نوراج کو اپنی ساری پونجی سونپ کر............اپنے بابل کے گھر............اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ مرگئی۔ لیکن میں کیسے مانوں کہ امرتا پریتم انتقال کرگئی ہے۔ جس عورت نے ساری زندگی قلمی جہاد کیا ہو۔ عورت کے ساتھ ہورہی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے خلاف قلم اُٹھایا ہو، جو عورت کو سماجی، معاشی، ذہنی اور جذباتی طور پر آزاد دیکھنا چاہتی ہو۔ جس نے اپنی شاعری سے پنجابیوں کا نام اونچا کیا ہو۔ جس نے سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کو کبھی تسلیم نہ کیا ہو، جس نے مردوں کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف بغاوت کی ہو ۔جس نے مذہبی اور سماجی ٹھیکیداروں کی منفی سوچ کے خلاف ساری عمر لکھا ہو۔ جس نے اپنی کہانیوں، ناولوں، سفرناموں اور سوانح حیات کے ذریعے صرف سچ کی آبیاری کی ہو، وہ بھلا کیسے مرسکتی ہے۔ مرا کوئی اور ہوگا۔ چتا کِسی اور کی جلی ہوگی، کسی دوسری عورت کا شریر سڑا ہوگا لیکن امرتا پریتم کا جسم نہیں سڑ سکتا۔ وہ نہیں مرسکتی۔ اُس کے مرشد نے کہا تھا ؎

''بُلھے شاہ اساں مرتا ناہیں گور پیا کوئی ہو''

(بلھے شاہ، ہم مر نہیں سکتے۔ قبر میں کوئی دوسرا دفن ہے)

اور امرتا پریتم باغی بلھے شاہ کی باغی جانشین تھی۔ اس لئے وہ کیسے مرسکتی ہے۔ وہ وارث

شاہ اور بلھے شاہ کی طرح زندہ ہے اور رہتی دُنیا تک زندہ رہے گی۔ اپنی شاعری میں، اپنے ناولوں اورافسانوں میں، اپنے سفرناموں میں اور اپنی ''رسیدی ٹکٹ'' میں۔ میری ''ٹھنڈی کانگڑی'' میں ادب کی آگ جلانے والی امرتا پریتم ہی تھی۔ جس نے میرا تعارف ادبی دُنیا سے کرایا پھر ''مائے نی میں کِینوں آکھاں''، ''بھُکھی مجھ''، ''مہری''، ''گھاہ تے چلنا منع اے''، ''امرُود دا رُکھ''، ''بالن ہڈ بلن'' اور ''کِس توں آپ لُکائی دا'' کہانیاں اپنے ماہوار پنجابی جریدے ''ناگ منی'' میں چھاپ کر امرتا پریتم نے مجھے خالد حسین بنایا۔ اُس زمانے میں ''ناگ منی'' میں چھپنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ وہ ادیب اور شاعر راتوں رات مشہور ہوجاتا تھا جو ''ناگ منی'' میں چھپا ہو۔ ادبی دنیا میں اُسے عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ''ناگ منی'' نئے لکھنے والوں کے لئے ایک پاٹھ شالا کا کام کرتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میری پہلی کہانی ''ناگ منی'' میں چھپنے کے بعد ایگریکلچر یونیورسٹی پنجاب کے شعبۂ پنجابی کے طلبہ اپنے سربراہ ڈاکٹر سریندر سنگھ دوسانجھ کے ہمراہ وادی کی سیر کو جب آئے تھے تو اُنہوں نے ایک گوردوارے سے اعلان کروایا کہ وہ پنجابی افسانہ نگار خالد حسین سے ملنا چاہتے ہیں۔ پنجابی ساہت سبھا سرینگر والوں نے خالصہ ہوٹل امیرا کدل میں اس ملاقات کا اہتمام کیا۔ مجھے اُن لوگوں سے مل کر بہت اچھا لگا اور مجھے خوب سے خوب تر لکھنے کی ترغیب ملی۔ پھر وہ دِن بھی آیا جب میں نئی دہلی گیا اور 25۔ حوض خاص کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ سیڑھیوں سے اُتر کر ایک شخص نے دروازہ کھولا اور پوچھا:

''آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کس سے ملنا ہے؟''

میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں کشمیر سے امرتا پریتم جی سے ملنے آیا ہوں۔ اُس شخص نے مجھے اندر آنے کے لئے کہا اور ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل میں آگئے۔ اُس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا:

''آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ امرتا بلغاریہ سے آئے کچھ ادیبوں کے ساتھ گفتگو کررہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا...... اور میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ہر تصویر فیض احمد فیضؔ کے کسی شعر کی عکاسی کررہی تھی۔ آرٹسٹ نے شعر کی روح کی تصویر میں اُبھارا تھا۔ خاص کر مجھے اُس پینٹنگ نے بڑا متاثر کیا جس میں فیضؔ کے شعر ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ رنگوں کا خوبصورت استعمال اور اُس میں اُبھرتا ہوا شعر کا مفہوم۔ تصویر

سیدھی روح میں اُترتی گئی...........میں ڈرائنگ روم میں نفاست کے ساتھ رکھی دیگر اشیاء کو دیکھ رہا تھا کہ وہی شخص آیا اور مجھے امرتا جی کے کمرے میں لے گیا بلغاریہ سے آئے ہوئے ادیب دوست باہر نکل رہے تھے...........میں نے امرتا دیدی کو جھک کر سلام کیا۔ اُس نے مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگی:

''سناؤ خالد! مجھے ملنے کی خواہش تمہارے اندر اب جاگی ہے۔ تم تو اپنی کہانیوں کی طرح خوبصورت بھی ہو (یاد رہے کہ اُن دِنوں آتش جواں تھی) وہ شخص مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اور دیدی باتیں کرنے لگے۔ اُس نے مجھ سے میرے خاندان، میری گرہستی اور ادبی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ میں جواب دیتا رہا اور بیچ بیچ میں خود بھی کوئی سوال کر لیتا۔ اُس کی شاعری سے متعلق، نثر کے بارے میں اور خاص کر ''رسیدی ٹکٹ'' کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ جس کا اُن دِنوں بہت چرچا تھا اور کچھ دھرم کے ٹھیکیدار، کچھ ادیب اور کچھ سماج سدھار امرتا پریتم پر گندگی اُچھال رہے تھے، لیکن اِن سماجی اور دھارمک جنونیوں کی منفی سوچ کی کیپسٹن سگریٹ کے دھویں میں اُڑاتے ہوئے امرتا پریتم نے کہا تھا:

''خدا ان لوگوں کو سچ بولنے اور سچ لکھنے کی توفیق عطا کرے۔''

بات چیت چل رہی تھی کہ وہی شخص چائے کے تین کپ اور کچھ بسکٹ ایک ٹرے میں لے کر آیا اور ٹرے میز پر رکھ دی اور خود بھی ایک کرسی کھینچ کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ دیدی نے تعارف کرایا:

''خالد! یہ امروز ہے۔ میرا آئیڈیل''

میں کرسی سے اُٹھا اور امروز بھائی کو گلے لگایا اور معافی مانگتے ہوئے کہا:

''بھائی صاحب! مجھے معاف کرنا، میں نے غلطی سے آپ کو نوکر سمجھ لیا تھا۔''

''جو بھی پہلے پہل یہاں آتا ہے وہ اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' امروز بھائی نے جواب دیا تھا۔

پھر میں امروز بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کی بنائی ہوئی پینٹنگز کے بارے میں، نئی کتابوں کے لئے بنائے گئے سرورق ''ناگ منی'' جریدہ کے لئے بنائے جانے والے خاکوں کے بارے میں اور مغربی پنجاب میں احمد سلیم کی طرف سے ''ناگ منی'' کے مواد کو گرمکھی سے شاہ مکھی کر کے ماہنامہ ''کُونج'' میں چھاپنے کے بارے میں۔ (''کونج'' میں میری بھی دو کہانیاں اردو رسم الخط

میں چھپی تھیں )۔ہم نے چائے پی اورامروز بھائی خالی کپ لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔اُس کے جانے کے بعد میں نے دیدی سے''رسیدٹکٹ'' کے حوالے سے پوچھا:

''دیدی ! اگر امروز تمہارا آئیڈیل ہے تو ساحؔر لدھیانوی کیا تھا'' تو امرتا نے جواب دیا تھا:''ساحؔر میرا خواب تھا۔امروز اُس خواب کی تعبیر ہے۔میرا پورک (مکمل)''امرتا پریتم نے سماجی بندھنوں کو کبھی نہیں مانا۔اُس نے سماجی جبر، جہالت، مذہبی شدت،تعصب اور سامراجیت کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھا۔اُس کا کہنا تھا کہ مذہبی نفرت،طبقاتی نفرت سے کم نہیں ہوتی۔

جیسی دُنیا امرتا کو ملی تھی، ویسی دُنیا اُسے بالکل قبول نہیں تھی۔اِسی لئے امرتا پریتم نے اپنی دُنیا خود تخلیق کی۔امرتا پریتم ایک سچی شاعرہ تھی،ایک ادیبہ تھی، وہ سچ لکھنے اور سچ کہنے میں یقین رکھتی تھی۔اُس نے سچ اور عشق کو کبھی نہیں چھپایا۔امرتا نے اپنی شخصیت کے سچ اور بے باکی کو''رسیدی ٹکٹ'' کے ذریعہ بیان کیا۔

امرتا پریتم نے جب آنکھ کھولی تب پنجابی ادبی دنیا کے اُفق پر اُستاد ہمدم، فیروز دین شرف،مولا نا بخش کُشتہ، پروفیسر موہن سنگھ ماہراورڈاکٹرفقیر محمد فقیرا یسے آفتاب چمک رہے تھے۔امرتا نے اُسی ماحول میں اپنی شاعری کا آغاز کیااورادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنانے لگی۔امرتا پریتم نے شاعری میں عشق ومحبت کے جذبات کواس طرح سے پیش کیا کہ اُس کی شاعری پنجابیوں کی پہچان بن گئی۔وہ اپنی زمین کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔وہ ایک ندی تھی............نرمل،کومل۔وہ ایک بہتا دریا تھی، ایک گہرا سمندر، ایک عورت، ایک آواز............ پنجاب کی آواز۔امرتا کی نظموں میں سچائی اور گہرائی تھی۔عورت کے جذبات کی عکاسی تھی ؂

وے میں تڑ کے گھڑے دا پانی/(وہ گھڑا جس میں دراڑ آئی ہو)
کل تک نہیں رہنا/اُومیرے ٹھنڈے گھُٹ دِیا مِترا (گھُٹ۔گھونٹ)
کہہ دے جو کچھ کہنا/دیکھ کے تیری تریہہ ورگی اِس پانی دی مجبوری/تریہہ(پیاس)ورگی(جیسی)
نہ اِس تیری تریہہ سنگ ٹُرنا (چلنا)
نہ اس ایتھے بہنا/وے میں تڑ کے گھڑے دا پانی/کل تک نہیں رہنا۔

تقسیم سے پہلے لاہور ریڈیو نے امرتا کوادبی شناخت بخشی اور وہ پنجابی ادبی حلقوں میں ایک شاعرہ کے طور پر مشہور ہوگئی تھی۔ملک کی تقسیم کے بعد وہ دہلی میں آ کر بس گئی۔پریتم سنگھ نے انارکلی بازار والی دُکان کا سودا چاندنی چوک کی دُکان میں بیچنا شروع کر دیا اور امرتا لاہور

ریڈیو کو چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسکرپٹ رائٹر اور اناؤنسر بن گئی۔میاں بیوی کے مزاج ملتے نہ تھے۔دونوں میں ذہنی ملاپ کبھی بھی نہ ہو سکا۔پریتم سنگھ کبھی بھی امرتا کے دِل اور روح میں اُتر نہیں سکا۔دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح رہے جو کبھی آپس میں نہیں ملتے۔دونوں کی سوچ میں تضاد رہا اور پھر دونوں نے الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔مگر پریتم زندگی بھر اُس کے نام کے ساتھ جُڑا رہا۔ وہاں نہ تو ساحر جُڑ سکا اور نہ ہی اِمروز۔دہلی میں رہ کر بھی امرتا نے مغربی پنجاب کی نمائندگی کی۔نظم، افسانہ، ناول غرض نظم ونثر میں ماجھے(ماجھی۔پنجابی زبان کی پانچ ڈائیلیکٹس میں سے ایک جو لاہور، امرتسر، سیالکوٹ اور گورداسپور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے ) کی لوک بھاشا اور صوفیانہ شیلی کو استعمال کیا۔

برصغیر ہند کی تقسیم نے سب سے زیادہ نقصان پنجاب کا کیا۔اس تقسیم نے پنجابی کلچر اور ورثہ کی اکائی کو توڑ کر رکھ دیا۔ہندو اور مسلم سیاست نے پنجاب کو برباد کر دیا۔پنجاب کی دھرتی انسانی خون سے لال ہو گئی۔تقسیم کے بعد رفیوجیوں اور شرنارتھیوں نے اپنے اپنے نام مکان، زمینیں اور دُکانیں الاٹ کروائیں۔لیکن امرتا پریتم نے اپنے نام صرف پنجاب کی تقسیم کا درد الاٹ کروایا............اور وہ دردا ُس کے اندر سے تب پھوٹ کر باہر نکلا جب وہ ریل گاڑی میں دہلی سے دہرہ دون جارہی تھی۔ ایک نظم کا جنم ہوا۔ایک لافانی نظم کا،جس کو سب سے پہلے اردو کے مشہور شاعر اور نغمہ نگار سیف الدین سیف نے اپنی کامیاب اور شہرۂ آفاق پاکستانی پنجابی فلم''کرتار سنگھ'' میں استعمال کیا۔اس نظم کو خوشونت سنگھ کی مشہور کہانی''ٹرین ٹو پاکستان'' پر بنائی گئی فلم میں بھی پیش کیا گیا اور امرتا پریتم کے ناول''پنجر'' پر بنائی گئی فلم میں بھی۔

آدھی صدی گذرنے کے باوجود بھی یہ نظم پنجابیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے ہتھوڑے کا کام دیتی ہے۔اس نظم نے امرتا پریتم کو شہرت کی بلندیوں پر جا کھڑا کر دیا۔یہ نظم اُس کی پہچان بن گئی............تقسیم کی ہولناکیوں پر ایک اور مشہور نظم بھی لکھی گئی۔جس کا عنوان تھا''ترنجن''(ترنجن۔ گاؤں کی چوپال یا وہ جگہ جہاں عورتیں بیٹھ کر چرخہ کاتیں اور گپ بازی کریں)''ترنجن'' احمد راہی کی تخلیق تھی جو اُس نے امرتا پریتم کے نام منسوب کی تھی۔احمد راہیؔ امرتسر کا رہنے والا تھا اور تقسیم کے بعد لاہور میں آباد ہو گیا اور روزی روٹی کمانے کے لئے فلموں کے گیت اور منظر نامے لکھنے لگا......اور امرتا لاہور کی رہنے والی تھی جو دہلی میں آباد ہو گئی۔اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقسیم کا درد سارے پنجابیوں کا مشترکہ درد ہے۔چاہے وہ مغربی پنجاب میں رہتے ہوں یا مشرقی پنجاب میں۔آزاد

بھارت اور آزاد پاکستان کی سرکاروں نے زمین کی حد بندی کر کے پنجاب کے سینے میں خاردار تار گھونپ دی اور پنجابیوں کے دلوں کولہُولہان کر دیا۔آج بھی یہ زخم پنجابیوں کے دِلوں میں تازہ ہیں۔

امرتا پریتم نئے لکھنے والوں کے لئے ایک آئیڈیل بن گئی تھی۔ وہ ساری زندگی روایت سے ٹکراتی رہی۔اُس کی نظموں میں نیا احساس اور نئی Sensibility تھی۔امرتا پریتم بنیادی طور پر شاعرہ تھی،لیکن وہ اپنے افسانوں، ناولوں،سفرناموں، انٹرویوز اور ''آپ بیتی'' کے حوالے سے بھی یاد کی جاتی رہے گی۔شاعری کے بارے میں امرتا نے کہا تھا:

''شاعری کے لئے ایک خاص موسم ہوتا ہے، جو شاعر کے دِل پہ آتا ہے۔اگر یہ موسم من کے اندر اُترے تو شعر ہوتا ہے ورنہ شاعری صرف قافیہ، ردیف، اور تُک بندی ہوتی ہے۔شاعری کے لئے کرافٹ کے ساتھ ساتھ خیال اور تخیّل کا ہونا بھی لازمی ہے۔''

امرتا پریتم انسانی آزادی کی زبردست حامی تھی۔جب روسی افواج چیکوسلوالیہ میں داخل ہوئیں تھیں تو امرتا بہت دُکھی ہوئی تھی۔اُس وقت پراگ شہر کے لوگوں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے اپنے گھروں کے نمبر مٹا دیئے تھے۔گلیوں اور سڑکوں کے نام اور نشان ختم کر دیئے تھے۔اُس وقت امرتا نے ایک نظم لکھی تھی ۔

''آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مِٹا دیا ہے/ گلی کا نام اور سڑک کا نشان بھی ختم کر دیا ہے/ اب اگر تم مجھے ڈھونڈنا چاہو/ تو دروازے کھٹکھٹاتے رہو/ ہر گلی، ہر شہر، ہر ملک میں جاؤ/ جہاں کہیں تمہیں کوئی آزاد روح مل جائے/ سمجھنا وہی میرا گھر ہے''

اُس کی نظموں کے ترجمے پڑھ کر ویتنام جنگ کے ہیرو ہُو چی مِین نے امرتا کا ماتھا چوم کر کہا تھا:

''تمہارا قلم میری بندوق جیسا ہے۔''

اور امرتا نے کہا تھا:

''آزادی نہ مانگی جا سکتی ہے، نہ چِھینی جا سکتی ہے اور نہ جسم پر اوڑھی جا سکتی ہے۔آزادی تو وجود کی مٹی سے اُگتی ہے۔''

امرتا پریتم کی زندگی کی ترجمانی رگ وید کا یہ شلوک بھی کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے ''صبح کی روشنی جب سورج کے ساتھ ملے تو اُس کی آنکھوں میں گیان (علم) کا کاجل ہو۔ہاتھوں میں محبوب کو سوغات دینے کے لئے وید منتر ہوں۔آزادی اُس کی سیج ہو اور دُنیا کے عالم اُس کے مرشد ہوں۔''

امرتا پریتم کی لگ بھگ 90 کتابیں چھپی ہیں۔اُس نے پنجابی کے علاوہ ہندی میں بھی

شاعری کی، ناول اور افسانے لکھے اور اردو میں کالم بھی لکھے۔ اُس کی تخلیقات کا ترجمہ ملک اور غیر ملکی کئی زبانوں میں ہوا۔ اُسے بے شمار ملکی اور غیر ملکی انعامات سے نوازا گیا۔ دیش و بدیش کی کئی یونیورسٹیوں نے اُسے ڈی لِٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کیں۔ اسے خوب عزت واحترام ملا۔1956ء میں شعری مجموعہ ''سنیہڑے'' پر اُسے ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔1969ء میں اُسے پدم شری ملا۔1982ء میں اُسے بھارتی گیان پیٹھ پُرسکار ملا۔1986ء میں اُسے راجیہ سبھا کے لئے نامزد کیا گیا۔ کامیابیوں کی ایک لمبی فہرست کے باوجود امرتا میں کوئی غرور، گھمنڈ، نازنخرا، اَنا، خود پرستی یا خود نمائی نہیں تھی۔ گفتگو میں نرمی اُس کی خوبی تھی۔ پیار اور خلوص تو اس کی ہڈیوں میں رچا تھا۔ وہ سراپا محبت اور شفقت کی مورت تھی۔

میں 1979ء میں دوبارہ نئی دہلی گیا، پاکستان جانے کے لئے ویزا لینے۔ پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے لمبی لائن دیکھ کر میں گھبرا گیا اور سیدھا امرتا دیدی سے ملنے حوض خاص چلا گیا۔ باتوں باتوں میں جب میں نے بتایا کہ میں پاکستان جانے کے لئے ویزا لینے آیا تھا لیکن لمبی قطار دیکھ کر ڈر گیا اور تمہارے پاس آ گیا تو دیدی نے پاکستان ہائی کمیشن میں کسی منیر احمد شیخ صاحب کو فون کیا اور میرے بارے میں ذکر کیا۔ فون بند کرنے کے بعد دیدی نے مجھے شیخ صاحب سے ملنے کے لئے کہا اور بتایا کہ منیر احمد شیخ پنجابی کا ایک عمدہ شاعر ہے اور ''ناگ منی'' میں اس کی نظمیں چھپ چکی ہیں۔ میں دوبارہ پاکستان ہائی کمیشن گیا اور مین گیٹ پر شیخ صاحب کے نام چٹ بھیجی۔ کچھ ہی دیر میں منیر احمد شیخ صاحب خود گیٹ پر آئے.......... مجھے گلے لگایا اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ وہ پاکستانی ایمبیسی میں فسٹ کلچرل سکریٹری تھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی اُنہوں نے چائے منگوائی اور اپنی پنجابی اور اردو نظمیں اور غزلیں سنانا شروع کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے ویزا افسر کو بلایا اور میرا پاسپورٹ اور ویزا فارم ان کو دیتے ہوئے کہا کہ کارروائی ذرا جلدی کریں۔ واپسی پر میں نے دیدی کو ساری تفصیل بتائی تو وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی:

''وہ شاعر ہی کیا جو اپنی شاعری نہ سنائے۔''

میں اُن دِنوں لداخ میں کچھ دن گذار کر آیا تھا۔ میں دیدی کو لداخ کے بارے میں جانکاری دینے لگا۔ وہاں کے موسم کے بارے میں، ننگے پہاڑوں، رتیلے میدانوں، پھلوں اور فصلوں، بدھ گمپا، یاک، دریائے سندھ اور وہاں کے لوگوں کے رسم ورواج کے بارے میں بتانے لگا۔ دیدی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ پھر اچانک وہ کہنے لگی ''خالد! کیوں نہ تیرا انٹرویو کیا جائے۔ جس

میں تم لداخی جیون کے بارے میں بھی بتاؤ گے۔‘‘..........اور پھر دیدی بستر میں لحاف اوڑھے بیٹھ گئی اور قلم، کاغذ پر چلنا شروع ہوگیا۔ میری ذاتی زندگی کے بارے میں سوال وجواب ہوئے۔ ادبی باتیں ہوئیں۔ میرے افسانوں کا تذکرہ ہوا۔ لداخ اور لداخی زندگی سے متعلق تفصیل سے گفتگو ہوئی، انٹرویو بہت اچھا بن گیا اور اکتوبر 1980ء میں ’’سوریہ انڈیا‘‘ کے ہندی ایڈیشن کے علاوہ پنجابی میں ’’ناگ منی‘‘ میں چھپا۔ امرتا پریتم ایسی مہمان ہستی میرے ایسے نئے لکھنے والے کا انٹرویو لے یہ میری حوصلہ افزائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل میں بڑا ادیب اور شاعر وہ ہے جو احساسِ برتری کا شکار نہ ہو۔ اُس میں کسی قسم کی انا نہ ہو اور اس زاویے سے امرتا خوب گُن وان بھی تھی اور دھن وان بھی۔

سماج کا ہاضمہ اُس کی ذاتی زندگی کو لے کر ہمیشہ خراب ہی رہا لیکن اُس نے سماج کی کبھی پرواہ نہیں کی اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے گذارا۔ اپنے دل کی مانی اور اپنی روح کو سکون بخشا۔ اُس نے عشق کئے تو کھل کر اعتراف بھی کیا۔ وہ کہتی ہے:

’’عشق ہر انسان کسی نہ کسی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ ایک سچائی ہے۔ اس کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ عشق سے ہی انسان کی تکمیل ہوتی ہے لیکن مرد اپنے عشق کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے جبکہ عورت عشق کو چھپاتی ہے۔ مرد پیار کو چوراہے میں رکھ کر لوگوں کو دِکھا دِکھا کر خوش ہوتا ہے لیکن عورت پیار کو اپنے پلو میں باندھ کر رکھتی ہے اور جب کوئی نہیں ہوتا تو پلو کھول کر اُس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ سچا عشق درد دیتا ہے اور سچی دوستی سکون دیتی ہے۔‘‘

اور سکون امرتا کو امروز کی بانہوں میں ملا۔ اُس کے پیار میں، اُس کی دوستی میں، امرتا پریتم نے بڑی لمبی بیماری دیکھی، بہت تکلیف سہی لیکن امروز بھائی نے جس سچے من سے، جس لگن اور محبت سے اُس کی تیمارداری کی، اُس سے امرتا کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ امروز اس کا ’’پُورک‘‘ ہے۔

جو دیکھ بھال، جو خدمت، جو سیوا، جو تیمار داری امروز بھائی نے امرتا کی کی، وہ نہ تو کندلاں کر سکتی تھی اور نہ نوراج، وہ خدمت نہ تو ساحر کر سکتا تھا اور نہ ہی پریتم سنگھ۔ یہ حق صرف امروز ہی ادا کر سکتا تھا اور اُس نے خوب ادا کیا۔ جسے زمانے نے دیکھا اور سراہا۔

میں اپنا یہ مضمون امرتا پریتم کی اُس لافانی اور شہرۂ آفاق نظم کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں جو اس کی شہرت کی وجہ بنی اور جس نے امرت کور کو امرتا پریتم بنایا۔

اج اکھاں وارث شاہ نُوں کِتوں قبراں وِچوں بول

تے اج کتابِ عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول

(آج میں وارث شاہ سے کہہ رہی ہوں کہ وہ قبر سے باہر آ کر بولے......اور آج کتاب عشق کا اگلا ورقہ کھولے)

اِک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لِکھ لِکھ مارے وین

اج لکھاں دِھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نُوں کہین

(ایک بیٹی پنجاب کی روئی تھی توتم نے لِکھ لِکھ کر بین کئے آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں اور وارث شاہ تمہیں پکار رہی ہیں)

وے دردمنداں دیا دردیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب

(اے دردمندوں کے مسیحا، اُٹھ اور اپنا پنجاب دیکھ۔ آج ہر سُو لاشیں بکھری پڑی ہیں اور چناب دریا خون سے لال ہو گیا ہے)

یہ شاہکار نظم لکھنے والی امرتا پریتم کبھی نہیں مر سکتی۔ وہ زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گی کیونکہ اُس کے مرشد بُلھے شاہ نے کہا تھا:

''بُلھے شاہ اساں مرنا ناہیں/ گور پیا کوئی ہور''

(بُلھے شاہ ہم مر نہیں سکتے۔ قبر میں کوئی دوسرا دفن ہے۔)

☆☆☆

Afsanvi Majmua"Ababilein ab nahin aayeingi" ka tajziyati mutala by

Mohd. Fareed (Dept. of Gojri Pahadi, BGSBU Rajouri)

**محمد فرید** (شعبہ گوجری پہاڑی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری) cell-9149971684

# افسانوی مجموعہ ''ابابیلیں اب نہیں آئیں گی'' کا تجزیاتی مطالعہ

پورا نام محمد ارشد۔قلمی نام محمد ارشد کسانہ۔والد کا نام محمد شفیع اور والدہ کا نام عالم بی ہے۔وہ 4اپریل1992 کو سرنکوٹ میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن پونچھ جموں و کشمیر ہے۔ان کی تعلیم ایم اے، ایم فل، نیٹ، پی ایچ ڈی ہے

تصنیفات:

1۔ابابیلیں اب نہیں آئیں گی، (افسانوی مجموعہ)

2۔اکیسویں صدی میں اردو ادب (تحقیقی و تنقیدی)

3۔پونچھ میں اردو ادب کی مختصر تاریخ (تحقیقی، تاریخی)

4۔کہیں تو سحر ہو گی (ناول)

آغازِ تحریر۔اور۔پہلی اشاعت 2018 سے کی جو کہ ایک افسانہ "روہنگیا"، تھا۔ان کی پہلی کتاب افسانوی مجموعہ "ابابیلیں اب نہیں آئیں گی ہے"جو 2019 میں شائع ہوئی۔

افسانہ ادب کی بہترین اصناف میں سے ایک ہے۔اُردو فکشن کی روایت کا زیادہ دارومدار ناول اور افسانے پر رہی ہے۔یہ اصناف ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔اردو ادب میں بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں۔اور افسانے کی روایت کا اندازہ ہمیں برسوں پرانا لگتا ہے جس کی باقاعدہ شروعات پریم چند کی افسانہ نگاری سے ہوئی۔اکیسویں صدی میں بہت سے افسانہ نگاروں نے اس صنف کو عروج بخشا۔ان میں ترنم ریاض، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ارشد کسانہ، ناصر ضمیر، دیپک بدکی، غلام نبی شاہد، ریاض توحیدی، عمر مجید، وحشی سید، غنی غیور، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''ابابیلیں اب نہیں آئیں گی'' ارشد کسانہ کا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کا عنوان بہت ہی معنی خیز ہے۔اس مجموعے کی ورق گردانی کر کے قاری کے ذہن

میں بہت سے سوالات سامنے آتے ہیں۔اور قاری کو تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اگر ہم لفظ "ابابیلوں" کا معنی ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ایک طویل واقع ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ابابیلوں سے مراد وہ لشکر جس نے ابرہہ سے خدا کے گھر کو بچایا تھا۔جس وقت ابرہہ نے چاہا کے میں خدا کے گھر کو منہدم کردوں گا۔تو اللہ کے بندوں نے اللہ سے التجا کی کہ یہ تیرا گھر ہے۔اور تیرے سپرد ہے۔اے پروردگار توں ہی اسکی حفاظت فرما۔اس وقت خدا تعالیٰ نے ابابیلوں کا لشکر بھیج کر ابرہہ کے ناپاک اور گھٹیا قسم کی سوچ اور ارادوں کو ختم کر دیا۔

ارشد کسانہ کے افسانوی مجموعے میں کل سترہ افسانے شامل ہیں۔اور یہ افسانوی مجموعہ کل ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے۔ان کے افسانوں میں انسانیت کا درس ملتا ہے۔سماج اور معاشرے میں جو ظلم وتشدد دیکھنے کو ملتا ہے۔جس کی وجہ سے ہر باپ خوف زدہ ہے، ہر ماں آہ و پکار کرتی ہے۔ بھائی بھائی کے دل میں ظلم کی وجہ سے خوف پھیلا ہوا ہے۔ارشد کسانہ نے سماج کے لوگوں کا دکھ درد پیش کیا ہے۔اور انکے احساسات وجذبات کو قلم کی گرفت میں لیا ہے۔جب قاری افسانہ پڑھتا ہے تو دل خون کے آنسوں رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ارشد کسانہ نے اپنے افسانوں میں نئے تجربات ومشاہدات ابھارے ہیں۔اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں کی صف میں ارشد کسانہ کا نام بھی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔نئ نسل کے قلمکاروں کے لیے ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔ارشد کسانہ کے افسانوں مجموعہ میں شامل "افسانہ تلاش کشمیر" جنت بےنظیر کی عکاسی کرتا ہے۔کشمیر کے حالات وواقعات کو قلمبند کیا ہے۔کشمیر کے بدتر حالات کی وجہ سے مکانات وعمارات، کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔زمین بنجر ہو چکی ہے:

’’دیوار سے اندر داخل ہوکر اس نے دیکھا کہ ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر اور بنجر زمین ہے۔صدیوں پہلے کی ٹوٹی ہوئی دیواریں کسی زمانے کے شہر کی نشانیاں بن کر کھڑی تھیں۔پتھر اور اینٹوں کے کئی ڈھیر لگے تھے۔ہزاروں کی تعداد میں درخت اوندھے منہ پڑے گل چکے تھے۔جاتی بلال کو یہ سب دیکھ کر یاجوج ماجوج یاد آ گئے۔اسے شک سا ہونے لگا کہیں یہ وہی دیوار تو نہیں۔مگر پیچھے مڑنا اسکی فطرت نہیں تھا۔اس نے آگے کا سفر شروع کر دیا۔وہ تھوڑے ہی آگے چلا تھا کہ اس کی نظریں اچانک ہزاروں کی تعداد میں بکھری ہوئی ہڈیوں پر پڑیں۔وہ ایک دم رک گیا۔اتنی ساری ہڈیاں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔آہستہ آہستہ وہ ایک، دو ہڈیاں ہاتھ میں لیکر ان کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ہڈیاں بہت پرانی ہونی کی وجہ سے گھس چکی تھی۔اس لیے انکی شناخت کرنا کافی مشکل تھا۔اس نے پھر نظریں اٹھا

کرادھرادھر دیکھا۔اچانک اسکی نظریں ایک انسانی جسم کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔وہ یہ سب دیکھ کرڈر گیا۔اس نے جلدی سے ہاتھ میں لیے سر کے ڈھانچے کوایک طرف پھینکا اور بھاگنے لگا۔وہ بھاگتے بھاگتے بہت دور نکل گیا۔مگر یہ مناظر اسکا پیچھانہیں چھوڑ رہے۔وہ چاہتا تھا کہ اس خوفناک علاقے سے رات ھونے سے پہلے ہی نکل جائے۔مگر یہ خوف کا میدان لمبا ہوگیا۔وہ پوری رات اسی طرح عجلت میں چلتا رہا'' (ابابیلیں اب نہیں آئیں گی. صفحہ نمبر 33)

''تلاش کشمیر''میں ارشد کسانہ نے ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔کشمیر کے نامساعد حالات کواپنی قلم کی گرفت میں لیا ہے کہ کیسے جاتی بلال کشمیر کے منظر کودیکھنے کے لیے آتا ہے۔اوراس کے دل میں ایک خواہش ہوتی ہے کہ میں جنت بےنظیر کودیکھوں گا۔اوروہاں کے مناظر کواپنے ذہن ودماغ میں قید کروں گا۔جب وادی کشمیر میں جاتا ہےتو کیا دیکھتا ہے۔گھروں کی دیواریں زمین میں مل چکی ہیں۔ہرطرف کھنڈرات ہی کھنڈرات آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔گھروں کے چھت ایسے زمین کے ساتھ مل گئے ہوتے ہیں کہ جیسے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جفت کر دیا جاتا ہے۔اور تمام کھنڈرات نشانیوں میں بدل گئے ہیں۔اوراس کے دل کی تمنا ابھی دل میں ہی دبی ہوئی ہے کہ ہوسکتا ہے آگے خوش نما منظر دیکھنے کو ملے۔جوں ہی آگے نکلتا ہے۔اورسفر کرتا ہے۔توں ہزاروں کی تعداد میں بکھری ہوئی ہڈیاں پر اسکی نظر پڑتی ہے۔وہ دیکھتے دیکھتے رک جاتا ہے کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔وہ آہستہ آہستہ ہڈیوں کے پاس چلا جاتا ہے۔اورایک دو ہڈیاں ہاتھ میں لیتا ہے،مگر ڈر اور خوف سے انھیں چھوڑ دیتا ہے۔کیونکہ ہڈیاں بوسیدہ ہوچکی تھیں۔کوئی پہچان نہیں ہورہی تھی۔تھوڑا اورآگے نکلتا ہے۔حیران کن ماجرہ دکھائی دیتا ہے۔اچانک آنکھوں کے سامنے انسان کے سر کا ڈھانچہ پڑا ہوا۔ڈروخوف کی وجہ سے وہ تمام مناظر کو وہی چھوڑ کر وہاں سے بھاگتے بھاگتے دور نکل گیا۔لیکن دوڑتے دوڑتے وہ تمام مناظر اسکی نظروں کے سامنے آرہے تھے۔اس نے سوچا کہ میں اس خوفناک علاقہ سے دور نکل جاؤں۔اور یہ خوف مجھے چھوڑ دے،جو بار بار مجھے ستا رہا ہے۔لیکن یہ خوف کا میدان بہت طویل ہوتا گیا۔وہ رات اسی ڈروخوف میں گزاری۔اوراسی عجلت میں پڑا رہا کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔وہ جسکی تلاش میں آیا تھا وہ سب تونہیں نظر آیا۔یہاں اسکا الٹا ہوا۔آخر کیوں؟ کہتے ہیں یہ جنت بےنظیر ہے۔اس میں یہ تمام مناظر کیوں درپیش آتے ہوں گے۔کیا جنت میں یہ تمام واقعات رونما ہوتے ہوں گے۔اگر ہوتے ہوں گےتو پھر جنت کیوں کہا گیا ہے:

''جاتی بلال نے اس مکان کو دیکھ کر کچھ دن یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔اس نے کمرے کے ایک کونے سے مٹی اور ریت ہٹانی شروع کر دی۔اچانک اس کے ہاتھ میں ایک کتاب آئی۔کتاب پوری طرح سے تباہ و برباد ہو چکی تھی۔اردگرد کے تمام اوراق ضائع ہو چکے تھے۔بس کوئی دس پندرہ صفحے ہی باقی بچے تھے۔مگر وہ بھی ناقص تھے۔پانی کی وجہ سے تحریر بالکل مٹ چکی تھی۔جاتی بلال نے ان تمام اوراق کو ایک ایک کر کے بڑے غور سے دیکھا۔باکل درمیان کے ایک صفحے پر صرف دوسطریں زندہ تھیں۔ان میں کچھ یوں لکھا تھا۔'یہ طوفان جو آج عروج پر ہے۔کہی سالوں سے اس کے آثار ہمیں نظر آرہے تھے۔مگر ہم مصروف تھے۔اپنے ذاتی معاملات میں۔اب جلد ہی یہ دونوں دریا ہمیں دنیا کے نقشے سے اتار پھینکیں۔'' (تلاش کشمیر صفحہ نمبر 34)

جاتی بلال کشمیر کی تلاش میں ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے اور کئی سال جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں میں رہنے کے بعد چپہ چپہ چھانٹ لینے کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔کشمیر کی تلاش جاری تھی۔جیسے اس نے تلاش شروع کی تھی کہ جاتی بلال قدیم زمانے کے ایک مکان پر جا پہنچا۔جس کی حالت بکھری ہوئی تھی۔ساری کی ساری چیزیں زمین میں مل چکی تھی۔کچھ کھڑکیوں کے نشانات باقی تھے۔اور ایک کمرہ جس میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔اس نے سمجھا کے کمرے میں رہنے کہ لیے جگہ ہے۔کیوں نہ آج یہیں پر ٹھہرا جاے۔آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔کمرے میں مٹی اور ریت کے ڈھیر لگے ہوے تھے۔اس نے کمرے کے کونے سے ریت اور مٹی کو صاف کرنا چاہا۔کہ بیچ میں سے ایک پھٹی پرانی کتاب ملی۔جس کے اوراق بوسیدہ حالت میں بکھرے پڑے تھے۔کوئی بھی سطر سہی طریقے سے نہیں پڑھی جارہی تھی۔بہت ہی محنت اور مشقت کے ساتھ جاتی بلال نے اس کتاب کے پھٹے پرانے اوراق کے ٹکرے جمع کیے۔اور پڑھنے کی کوشش کی لیکن ان کی حالت بری تھی۔دیکھتے دیکھتے اندر سے ایک صفحے پر ایک سطر لکھی ہوئی تھی۔جسکا معنی مفہوم جو مجھے سمجھ آیا ہے۔وہ یہ کہ کشمیر میں خون ریزی کا طوفان صدیوں سے عروج پر تھا۔اور آج بھی وہی حالت ہے۔کوئی سدھار نہیں آئی۔اور ہم بھی مصروف رہے اپنے اپنے کاموں میں۔ہمارے لوگوں نے خون کا نظرانہ پیش کیا۔جو آگ لگی تھی وہ آج بھی ایسے ہی ہے۔جانیں جارہی ہیں۔کسی کوئی فکر نہیں۔سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔۔۔۔۔۔۔۔

''ابابیلیں اب نہیں آئیں گے'' کا میں نے مکمل طور پر سے مطالعہ کیا ہے۔اور ایک ایک افسانے کو بڑی گہرائی سے پڑا ہے۔ہر افسانے کا مطالعہ میرے لیے قابل غور تھا۔اسلیے میں نے

انہیں وقت نکال کر کے سنجیدگی سے ورق گردانی کی ہے۔ نہایت ہی سبق آموز افسانے میری نظروں سے گزرے ہیں۔ اور ایک افسانہ جو اس مجموعہ میں شامل ہے۔ افسانے کا نام "ایل۔او۔سی۔" ہے۔ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا ہے جو قاری کو اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے۔ اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔کہ آخر "ایل اوسی" پر ایسے واقعات کیسے رونما ہو سکتے ہیں۔اور غربت کے ماروں پر کیا گزرتی ہے۔فائرنگ کے چلتے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر کہا جائیں۔گاؤں کی سڑکیں، اور پھر گاڑیوں کا وقت پر نہ ملنا۔ پورا دن گاڑیوں کی تلاش اور انتظار میں گزرنا۔گاڑیاں کم اور لوگوں کی بھیڑ زیادہ۔اور پھر دل میں یہ خوف بھی کے شام کو "ایل اوسی" پر کب فائرنگ شروع ہو جائے کوئی پتہ نہیں۔سوچ اور فکر لوگوں کو بوڑھا بنا دیتی ہے:

''میں نے چاہا کہ باتیں ایک بار پھر شروع ہوں گی۔مگر گاڑی کا شور ہر بار میری چاہت پر پانی پھیر دیتا ہے۔اس لیے میں سرکتے ہوے۔اس کے پاس پہنچ گیا۔میرا منہ ابھی کھلا ہی نہیں تھا کہ اچانک "ٹک ٹک ٹک ٹک" کی آوازوں سے پورا علاقہ گونجنے لگا۔ہم دونوں ایک دم حرکت میں آ گئے۔" لگتا ہے باڈر پر فائرنگ شروع ہوگئی" اس نے گھبراتے ہوے کہا۔جلد ہی یہ آوازیں اور تیز ہوگئی۔ میرے اندر خوف نے ایک اور ہلچل مچا دی۔میرا گھر سرحد کے قریب تھا۔مگر میں دعا کر رہا تھا کہ یہ فائرنگ ہمارے گاؤں کے علاوہ کسی اور جگہ ہو مگر آوازیں ہماری طرف ہی آ رہی تھیں۔میرا خوف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔فائرنگ کی آوازیں سن کر ڈرائیور نے بھی گاڑی تیز کر لی۔ہم لگ بھگ ایک گھنٹے بعد ہاڑی موڑ پہنچے۔ میں نے اترتے ہی اندھیرے میں اپنے گاؤں کا جائزہ لیا۔فائرنگ لگاتار جاری تھی۔آگ کی طرح چمکتی ہوئی گولیوں کی لڑیاں خلا میں ادھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔رک رک کر بم بھی پھٹ رہے تھے۔ایک دم طوفاں برپا تھا۔گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی کھول کر نیچے سڑک کی طرف بھاگ رہے تھے۔ان کی چیخیں لگاتار خلا میں گونج رہی تھیں۔میرے گھر میں تین چھوٹے چھوٹے بچے اور مال مویشی کون سنبھالتا۔ایک میری بیوی کیا کیا کرتی۔میں بے ساختہ اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔مگر ابھی تھوڑا ہی دور نہ پہنچا تھا کہ فورسز نے پکڑ لیا۔میں چلا چلا کر اپنی مجبوری بتا رہا تھا۔مگر انھوں نے ایک قدم بھی خطرے کی طرف بڑھنے نہیں دیا۔رات بھر ہم یہ منظر دیکھتے رہے۔پوری رات سڑک پر جمع ہوے لوگوں میں اپنے بیوی بچوں کو ڈھونڈتا رہا۔مگر بے سود۔صبح کے چھ بجے فائرنگ بند ہوئی'' (ایل۔او۔سی صفحہ نمبر 71)

جب حالات ناساز گار ہو جائیں۔کانوں میں کئی قسم کی آوازیں گونج رہی ہوں۔اور گھر

میں مال مویشی، بیوی بچوں کی فکر بھی بار بار ستا رہی ہو۔اس وقت کچھ ذہن میں نہیں آ تا کہ میں کہا جا رہا ہوں۔اور ابھی تھوڑے ہی لمحے میں میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے۔کوئی پتہ نہیں۔کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔جن لوگوں کا گھر سرحد کے قریب ہوتا ہے۔انھیں اکثر گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔جاتی بلال جو کہ ہاڑی موڑ کا رہنے والا تھا۔جب وہ ہاری موڑ پہنچا تو اندھیرے میں گھر کی فکر ستانے لگی۔رک رک کر بم پھٹ رہے تھے۔ایک دم طوفاں بر پا تھا۔گاوں والے اپنے مال مویشی کو لے کر نیچے کی طرف بھاگ رہے تھے۔مجھے فکر دامن گیر ہوئی کے میرے گھر والے اور مال مویشی کا کیا ہوگا۔بے ساختہ بھاگنے لگا۔اور گھر کے نزدیک لوگوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔تھوڑا آ گے پہنچا فورسز نے پکڑ لیا۔اپنے حالات بتائے اور چیخ و پکار کی۔رات بھر گھر کا منظر دیکھتا رہا۔سڑک میں جو بھیڑ جمع تھی۔ان میں اپنے بیوی بچوں کو تلاش کرتا رہا۔مگر بے سود۔صبح کے چھ بجے فائرنگ بند ہوئی۔فورسز نے آٹھ بجے گاؤں کی تلاشی لینی شروع کی۔میں نے ایک آفیسر سے آہ پکار کی۔اور کہا مجھے گھر جانے دیں۔اس کو میرے حال پر رحم آیا۔مجھے چھوڑ دیا۔جوں ہی آ گے بڑا کیا دیکھتا ہوں میرے گھر کے قریب بھیڑ ہی بھیڑ جمع تھی۔میری بیوی کو چار پائی پہ لے جا رہے تھے۔مجھے دیکھنے نہیں دیا۔گھر کے قریب تینوں بچوں کی لاشیں تھی۔میری ساری امیدیں ایک لمحے میں ختم ہو گئیں۔

''میں نے چاہا کہ اس کے آنسوں پونچھ ڈالوں مگر عورتوں کے بیچ جانے کی مجھے اجازت نہ تھی۔کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے آنسوں دونوں ہاتھوں سے پونچھے اور وہاں سے اٹھ کر ایک بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ گئی۔وہ عورت اپنے سامان کو تکیہ بنائے سو رہی تھی۔لڑکی بالکل اس کے قریب بیٹھ کے اسے بڑے غور سے دیکھنے لگی'' (میں شرمندہ ہوں۔۔صفحہ نمبر 61)

سماج کے تئیں ہمدردی اور محبت کا جذبہ سامنے جھلکتا ہے۔"میں شرمندہ ہوں" کے اقتباس سے بہت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ کہ سماج کے غریب افراد کبھی کسی اسٹیشن پر بھی ملیں تو وہاں ان سے محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔کیونکہ قاری کو افسانے میں محو کرنے کے لیے مصنف نے ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔جس کو پڑھنے کے بعد اندر سے احساس کی چنگاری میں دوبارہ سے آگ جلنی شروع ہو جاتی ہے۔مصنف نے سماج میں ہو رہی ناانصافی اور ظلم و جبر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اور بڑے خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

''میں شرمندہ ہوں" ایک کامیاب اور بہترین افسانہ ہے۔اس افسانہ کا موضوع ایک چھوٹی نو سالہ بچی، جس کو انسان نام کے وحشی درندوں نے اپنی زیادتی کا شکار بنایا۔ایسے موضوع پر

بہت سے قلمکار اپنی قلم کو جنبش دیتے ہیں۔جس انداز سے مصنف نے کہانی اپنا موضوع بنایا ہے۔لگتا نہیں کوئی قلمکار ایسی حقیقت کو افسانے میں لڑی کی طرح پرو دے۔تمام افسانوں میں ایسی گہرائی ملتی ہے کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سب کے بارے میں تو مجھے نہیں پتہ مگر میری ابھی زندگی بہت باقی تھی۔کچھ بے رحم جانوروں نے مجھ پر اچانک حملہ کر دیا اور میرے جسم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔مگر میری روح ابھی زندہ ہے۔اور یہ تب تک زندہ رہے گی۔جب تک میرا اصل وقت نہیں آتا۔''

''کیا ہوا آپ کے ساتھ؟

''رہنے دو مجھے بتانے میں شرم آتی ہے۔'' (میں شرمندہ ہوں۔صفحہ نمبر 62)

ارشد کسانہ کا افسانہ 'ابلیس کا ساتھی" موجودہ دور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ایسے دور کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں انسانی قدریں، احساس و ہمدردی، پیار و محبت، اخوت بھائی چارہ کا نام نشان بھی نظر نہیں آتا۔قدیم دور میں ایک دوسرے سے میل ملاقات، اخلاق کے ساتھ آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا،، لگا رہتا تھا۔آج سماج سے وہ تمام چیزیں مٹ چکی ہیں۔شیطانی غلبہ ہے۔اس کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے ارشد کسانہ نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اقتباس دیکھیں:

''ہاں سارے جانداروں میں تو یہی ہاہا کار ہے۔اور ہمارے سیارے والوں نے تو اس پر باقاعدہ تجربے بھی کئے ہیں۔نتیجہ ہر ایک کا یہی ہے۔کہ تمہارے سیارے پر اب ابلیس کی حکومت ہے''

(افسانہ،ابلیس کا ساتھی)

''ابابیلیں اب نہیں آئیں گی'' ارشد کسانہ کا ایک اہم افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں شامل دیگر افسانے،شرنارتھی، ابابیلیں اب نہیں آئیں گی، خاکی، بابر کا سفر، میں غدار نہیں ہوں، تابوت، رنگے ہاتھ،آب زم زم، یہ صدی ہماری ہے، سانجھ، انجان نمبر، خدا حافظ، عظیم شکست، شامل ہیں۔ارشد کسانہ نے نہایت ہی سلیقے سے پلاٹ سازی اور جذبات نگاری پیش کی ہے۔انہوں نے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔اور ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔واقعات کو سلیقے سے بیان کرنا انکا ہنر ہے۔

☆☆☆

Qaumi Yakjahti mein gojri zaban ka kirdar by Mohd. Fareed (Dept. of Gojri Pahadi, BGSBU Rajouri)cell-9149971684

**محمد فرید** (شعبہ گوجری پہاڑی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونی ورسٹی، راجوری)

# قومی یکجہتی میں گوجری زبان کا کردار

گوجری زبان برصغیر کی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان میں سرکاری سرپرستی حاصل کرنے کے بعد لکھی اور بولی جاتی ہے۔اس زبان کا تعلق شورسینی آپ بھرنس سے ہے گوجری زبان کا تعلق گجر قوم سے ہے تاریخ شاہد ہے کہ زبانوں کا تعلق مذہب، قوم یا علاقے سے ہوتا ہے۔ گجر قوم پر قدم سے پہلی صدی عیسوی تک وسط ایشیا سے ہجرت کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ گجر قوم ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلنے لگی۔ راجستھان اور گجرات پہلے دو مرکز ہیں۔ جہاں گوجری زبان اور گجر قوم کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔جب گجرات کا نام بھی اسی قوم کی بنیاد پر پڑا۔محمد اکرم چوہدری گوجری زبان کے آغاز کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

’’گوجری زبان برصغیر کے ہر خطے میں تھوڑے بہت لہجے کے فرق کے ساتھ پانچویں صدی عیسوی سے باقاعدہ طور پر عوامی اور سرکاری زبان رہی ہے۔‘‘

(محمد اکرم چوہدری، اردو اور گوجری کے لسانی روابط، کوٹلی، 2016ء ص۔126)

ڈاکٹر جمیل جالبی گوجری زبان کے آغاز کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

’’گجری ادب کی یہ خالص ہندوی روایت ہے۔اس عرصے میں ڈھل منجھ کر اتنی صاف اور مقبول ہو جاتی ہے۔کہ بعد کی نسلیں بھی اپنے متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لیے اس روایت کی مخصوص ہیت کو پسند کرتی ہیں۔‘‘

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، 2017ص 71)

گوجری زبان ہندوستان کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔اور یہ زبان ہندوستان کے مختلف خطوں میں بولی جاتی ہے۔ان میں راجستھان، گجرات مدھیہ پردیش، اتر پردیش، ہریانہ

پنجاب، اترا کھنڈ، ہماچل پردیش اور جموں وکشمیر اہم مرکز ہیں۔اس زبان میں قومی یکجہتی کی مثال قدیم گوجری شعراء کے کلام سے ملتی ہے۔ پیار ومحبت اخوت و بھائی چارہ امن وسلامتی، مذہبی رواداری جیسے موضوعات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔گوجری شاعری میں قومی یکجتی کو پروان چڑھانے میں صوفیوں سنتوں اور فقیروں کا اہم کردار رہا ہے جن میں سید نورالدین ست گرو، امیر خسرو، شاہ میراں جی ) بہاوالدین با جن، شاہ علی جیو گام دھنی، برہان الدین جانم، خوب محمد چستی، جگت گرو، اور امین گجراتی کے نام قابل ذکر ہیں۔قدیم گوجری شعراء کے ہاں مساوات، رواداری اور انسان دوستی کا پیغام ملتا ہے۔گوجری ادب کو دو حصوں میں تقسیم ہم کیا کیا جاتا جا ہے۔قدیم گوجری ادب اور جدید گوجری ادب۔جدید گوجری ادب کی شروعات لار دربار سے بیسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔سب سے پہلا نام میاں نظام الدین لاروی، نوں پونچھی۔سائس قادر بخش، علم دین بن باسی، مولانا مہر الدین قمر، فتح محمد، درہالوی، خدا بخش زار، سائس فقر دین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے کلام میں بھی بھائی چارگی کا پیغام ملتا ہے۔

گوجری زبان میں قومی یکجہتی اور اپسی بھائی چارہ کے شواہد گجر صحافت سے بھی ملتے ہیں۔ 1954 میں شائع ہونے والا گوجری اخبار نوائے قوم اور 1965ء میں رسالہ گجر دیش نکلنا شروع ہوا۔ان کے بانی سروری کسانہ تھے۔ان دونوں رسالوں میں گوجری مضامین اور نظمیں شائع ہونے لگے۔زیادہ تر مضامین قومی یکجہتی کے شامل تھے۔گوجری شعری ادب کے علاوہ افسانوی ادب میں بھی قومی یکجہتی کی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔سال 1947ء میں ملک کے دو حصے ہو گے۔جموں وکشمیر کے گجر طبقہ کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔گجر قوم پر حد سے زیادہ ظلم جموں وکشمیر میں ہوئے۔گجر قوم کے لوگوں میں ملک کے لیے پیار و محبت کا آپسی رواداری کا جذبہ حد درجہ اتم پایا جاتا ہے۔عبدالحمید کسانہ کا گوجری کا افسانہ ''مجرم'' قابل ذکر ہے. جو قومی یکجہتی کی مثال ہے۔جنگ کے دوران گجر قوم نے قومی یکجھتی کو ہی موضوع بنایا۔ایم کے وقار کا افسانہ ''ست سری کال'' بھی قابل ذکر ہے۔گوجری نظم میں قومی یکجہتی کی مثال پیش خدمت عبدالغنی عارف کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

خوشیں خوشیں آومناواں آزادی کو دھیاڑو　　ہمت نال مکایو ہم نے ایک زمانو ماڑو
صدقو آزادی کو دیکھو کتوں کت گیا ہم　　غیراں نے آزما چھڑیا ہاں لسانہیں ہن رہیا ہم
گاندھی تے آزاد کی ہمت دیکھو ہمت لیائی　　نہرو جی کی ہمت جرآت ملک کی شان بنائی

(چھمر چھاں، ص 95)

گوجری نظم میں قومی یکجہتی کی ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔شریف قمر کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

ہولی، عید یوالی سانجھی سانجھا ہسیں رسیں لوک
ہم اس دیش کا وارث ہاں جس دیش ماں رل مل بسیں لوک
جس دیش ماں گنگا جمنا ہے جس دیش ما جہلم راوی ہے
جت بہار گوکلو قاصد ہے جت برھیا نیلی ساری ہے
جت کھول گھمنڈنا ہوردسے جت پیار پریت ہی ہاوی ہے
جت دیور جیٹھ ہیں بھائی برابر جت ماں گے رتبے بھابھی ہے (منکا موتی ۔۔۔166)

شریف قمر کا زیادہ کلام قومی یکجہتی پر ہے ایک اور گوجری نظم کے کچھ اشعار جن میں قومی یکجہتی کی خوب عکاسی کی ہے۔اشعار ملاحظہ کریں: ے

مورتے بلبل، طوطا مینا نچیں اس گمان ماں سب تے پہلا بستی بسی میرا ہندوستان ماں
پاہ تہذیب ہے گنگا جمنی نالے چناب گی پیر پنچال کی اچی چوٹی سنگ لانویں آشمان نا
سب تو پہلاں بستی بستی میرا ہندوشان ماں اتے مندر مسجد گمپا اتے سکھ عسائی
اتے دین دھرم کا چرچا گیتا، وید، اقرآن ما سب تو پہلاں بستی بستی میرا ہندوستان ماں
اتے عید، دیوالی ،راکھی اتے نوروزوی اتے بینی بتکرا جاں الڑمست جوان ماں

(منکا موتی ص 168)

قومی یکجہتی کے موضوع پر صدام حسین صارف کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اوچن کی چانن ائے ڈل کا پانی، تیرا کنارہ وطن کے ناں ہیں
گلاب بلبل یہ پھیل نے تتلیں چمکتا تارا وطن کے ناں ہیں
یہ کھلتیں پھلتیں امید مھاریں وفا کی رتاں ماں رہیں ہمیشاں
عزیز ہمناں ہے دیش اپنو یہ ہیلا چاراوطن گے ناں ہیں
خوشی غمی ماوی جان تلی ور رکھیں سپاہی وطن کی خاطر
لہو شہداں گے نال بغنا، وے اتھروں کھاراوطن گے ناں ہیں

قومی یکجہتی میں گوجری گیتوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔جدید گوجری ادب میں بہت سارے. شعراء نے گوجری گیت لکھے جن میں سروری کسانہ،مہرالدین قمر،علم دین بن باسی ،نسیم پونچھی-عبدالغنی عارف، اقبال عظیم منشاء خا کی -بابونورمحمد نور-خادم خا کی شریف قمر،عبدالرشید شبنم،

گلناز چوہان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عبدالرشید شبنم گوجری گیت لکھتے ہیں۔ ایک بلند ملاحظہ کریں۔

دنیا اندر سب تیں سوہنی دھرتی ہندوستان گی
یاہ ملکیت سیکھ ہندو تے نالے مسلمان گی
گاندھی کا ارمان ہیں اس مانھ سوہنی سوچ کلام کی
دنیا اندر سب نہیں سوہنی دھرتی ہندوستان کی

گوجری بیت اور سی حرفی میں بھی قومی یکجہتی اخوت اور رواداری کی مثال قائم ہے۔گوجری سری حرفی کے مشہور شاعر حسن دین حسن، خدا بخش زار، سائیں قادر بخش سائیں فقر دین، عبدالغنی عارف۔خادم خاکی۔عبدالرشید شبنم اسلم شیراز، ممتاز چوہدری وغیرہ نام قابل ذکر ہیں۔عبدالرشید شبنم بھائی چارگی کے متعلق گوجری میں لکھتے ہیں۔ملاحظہ کریں:

ہندو مسلم بسیں نالے سکھ بھائی میرا دیش گی یاہ ہی ہے شان مولی
رکھئے دور فتور گا چھکھڑاں تیں رکھئے قائم توں امن امان مولی
ذات پاتے تیں اوپر ہے دیش اپنو چاہوے خدمت اسکی دل وجان مولی
ہے دعا شبنم اجے دیر توڑی رکھیئے باقی توں اس گونشان مولی
امن دوستی مہار و پیغام یوہی دینی عزت تے مان ہمیش سب نا
رہیں محفوظ حد سرحد اپنی پیاروں جان کولوں ہے یو دیش سب نا
آویں پیار محبتا نال جیکر کراں دل کڈھ گے ہم پیش سب نا
کراں جان شبنم قربان اس ورکرے مچ سلام یود پیش سب نا

گوجری زبان وادب میں بہت سے شعراء نے سی حرفیات لکھیں ہیں۔اور اپسی بھائی چارگی کا ثبوت گوجری سی حرفیوں میں ملتا ہے۔اسی حوالے سے سی حرفی کے چار مصرعے ملاحظہ کریں:

الف: آچنا چڑھ گے دیکھ اُچے میرا دیش ماکیڈ بہار آئی
چمکیں تاراں دیکھوا شمان اندر رونق مرگاں مانھ بیشمار آئی
مانجھی مال چاریں ان بہکاں مانھ رونق مڑ گے فر ایک وار آئی
سنگی سب شبنم خوشحال بسیں سارا دکھ خلقت ہے بہار آئی

قومی یکجہتی میں گوجری زبان کے شعراء،ادباء نے اپنے قلم کو جنبش دی۔جن کی شاعری میں

قومی یکجہتی کا جذبہ پوری طرح تابانی کے ساتھ کارفرماء ہے۔گوجری زبان میں لکھنے والے بہت سے ایسے شعراء بھی ہیں۔جنہوں نے قومی یکجہتی کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا ہے۔ان کی شاعری کا جائزہ چند صفحات پر لینا ممکن نہیں۔اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گوجری شاعری اور فکشن نے قومی یکجہتی میں جو کردار نبھایا ہے۔اور ابھی بھی نبھا رہی ہے۔نا قابل فراموش ہیں۔اور امید ہے کہ گوجری زبان میں بھی قومی یکجہتی کا جذبہ اسی طرح موجزن رہے گا۔جس طرح دوسری زبانوں میں ہے۔

**حوالے:**

1۔مہاروادب، الحاج چوہدری حسن دین حسن نمبر، جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز، 2015ء
2۔جھلنگو،عبدالحمید کسانہ،2023
3۔گوجری افسانہ کو موضوعاتی جائزہ،محمد ارشد کسانہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی،2023ء۔
4۔قدآور مولانا مہرالدین قمر،حسن پرواز، جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ،کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر،
5۔چھمر چھاں،عبدالغنی عارف،شالیمار آرٹ پریس سرینگر،1980ء
6۔دھکھتیں آس،اسرائیل اثر، روبی پریس جامع مسجد سرینگر،1979ء

☆☆☆

Pandit Prem Nath Pardesi aur Riyasati Urdu Afsana by Suresh Kumar(Research Scholar, Dept. of Urdu,Central University of Kashmir, Gandarbal)cell-8492939325

**سُریش کمار**( ریسرچ سکالر شعبۂ اُردو ج، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل )

# پنڈت پریم ناتھ پردیسیؔ اور ریاستی اردو افسانہ

زمانۂ قدیم سے ریاست جموں وکشمیر علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں پر لکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہمارے سامنے آتی ہے جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تخلیق کیا اور اب بھی تخلیقات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے لکھنے والے مل جاتے ہیں جنھوں نے پرانے لکھنے والوں کے شانہ بشانہ چل کر ادب وفن کی تخلیق کی اور اسے عروج بخشا۔ ریاست جموں وکشمیر کے دلفریب نظارے ایک ادیب کو گنگنانے و کچھ سوچنے اور کچھ تخلیق کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان دلفریب نظاروں کے علاوہ یہاں کے غریب عوام جو مفلوک الحال بھی ہیں ادیبوں کے لئے نئے موضوعات فراہم کرتے ہیں۔ریاست کے ان دلفریب نظاروں سے متاثر ہوکر ادیب اپنے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ان ہی دلفریب و دلدوز نظاروں کو ادیب اپنے افسانوں اور ادبی فن پاروں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے ابتدائی لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام پریم ناتھ پردیسیؔ کا آتا ہے اور پھر ان کے بعد افسانہ نگاروں کا ایک کارواں چل پڑتا ہے اور یہ کارواں آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔اس دوٗر میں جن افسانہ نگاروں نے ادبی فن پارے کو تخلیق کیا ان میں ایک اہم نام پریم ناتھ پردیسی کا ہے۔جن کو ریاست میں اردو افسانے کا موجد بھی قرار دیا جاتا ہے۔

**پریم ناتھ پردیسی:۔** افسانہ نگاری کی دنیا میں سب سے اہم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسیؔ کا ہے جن کی بے وقت موت نے اس مخصوص اندازِ افسانہ نگار کو جسے وہ بعد میں فروغ (دینا چاہتے تھے) دینے لگے تھے یکا یک ہم سے جُدا کر دیا۔اور اس طرح سے اردو افسانے میں ارتقاء کے جو امکانات تھے انھیں ختم کر دیا اور اردو افسانہ ایک نئے ابھرتے ہوئے رجحان سے کشمیری

محروم ہو گیا۔ پردیسی ایک بڑی رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے۔

پریم ناتھ پردیسیؔ کشمیری پنڈتوں کے ایک نچلے طبقے کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کی ولادت ۱۹۰۹ء میں ہوئی، گھر کے حالات موافق نہیں تھے۔اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کی رسم کے مطابق ان کا بیاہ بھی کم عمری میں ہو گیا تھا۔ اس لئے جلد تعلیم ختم کر کے ملازمت کی تلاش کرنی پڑی۔اور ۳۲-۱۹۳۱ میں انہوں نے محکمہ چنگی (ٹیکس) میں ملازمت حاصل کی۔اس محکمہ میں اسسٹنٹ انسپکٹر تک پہنچتے پہنچتے انہیں چودہ سال لگے اس وقت کشمیر میں جو کلچرل فرنٹ کی تحریک شروع ہوئی تھی پردیسیؔ بھی اس سے وابستہ رہے۔اس تحریک سے منسلک ہونے کے بعد پردیسی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔اس سے پہلے انھوں نے کچھ کہانیاں بھی لکھیں تھیں جو کہ رومانی انداز کی کہانیاں تھیں لیکن ترقی پسند تحریک کے اثر کے تحت پردیسی کشمیر کی حقیقی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے۔۱۹۴۷ کے بعد انھیں ریڈیو کشمیر میں ملازمت مل گئی اور پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

پریم ناتھ پردیسیؔ نے کئی ڈرامے، فیچر اور مضامین لکھے۔لیکن پردیسی کو جس صنف میں سب سے زیادہ شہرت حاصل رہی وہ صنف افسانہ ہے۔اردو افسانہ میں پردیسی نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے ۔ان کے افسانوں کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن میں 'شام وسحر'، 'دنیا ہماری' اور 'بہتے چراغ' قابل ذکر ہیں ان افسانوں کے علاوہ بہت سے افسانے ایسے ہیں جو اخباروں اور رسالوں کے پرانی فائیلوں خاص طور پر 'مارتنڈ' کے ادبی شماروں میں محفوظ ہیں۔افسانہ دراصل پردیسی کا مخصوص میدان تھا اور اس میں ان کی طبیعت کے جوہر چمکے اور خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو جانے کے بعد انھوں نے افسانے لکھے۔ان میں سماجی اور ابلاغی قدروں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اپنے ایک خط میں اس نئے رجحان کے طلوع ہونے کے بارے میں لکھا تھا۔

''۱۹۳۲ سے ۱۹۳۸ تک جو کچھ میں نے لکھا تھا اس پر میں فخر نہیں کر سکتا اس وقت تک مجھے یہ احساس ہی نہ تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن کے کیا فرائض ہیں۔''

(کشمیر میں اردو، حصہ دوم، عبدالقادر سروری، جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر)

ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رجحان میں یہ تبدیلی افسانوں کے مجموعے ''انگارے'' پڑھنے کے بعد ہوئی۔ان کے افسانوں کے مجموعے ''شام وسحر'' کا تعارف پروفیسر نند

لال کول طالبؔ نے لکھا تھا۔'' بہتے چراغ'' بعد میں لکھا ہوا مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

خواجہ غلام محمد صادق جو اس وقت کلچرل فرنٹ کے روح رواں تھے نے پردیسی کی صلاحیتوں کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔'' پردیسی ہماری ریاست کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے''۔صادق نے پردیسی کے دو اور افسانوی مجموعوں'' کیچڑ کے دیوتا'' اور'' جنگ اور نغمہ'' کا تذکرہ کیا ہے جو چھپ نہیں سکے۔ پروفیسر احتشام حسین پردیسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''فن کار کے لئے سچائی اور سادگی دو بڑے سہارے ہیں جن کی مدد سے وہ فن کی دشوار گزار وادیوں میں سفر کرتا ہے۔ پردیسی کے پاس یہ دونوں سہارے تھے''۔اس لئے ان کی افسانہ نگاری میں حسن اور کشش کے ساتھ تاب وتواں ہے۔''(ایضاً،ص۔۴۳۵)

نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد پردیسی نے جتنے افسانے لکھے ان میں کشمیر اور کشمیر کے محنت کش عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس بات کو صادقؔ صاحب نے اپنے تعارف میں پردیسی کے بارے میں لکھا ہے۔وہ کشمیری عوام کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچے اور یہ بیرونی زندگی کے خدوخال تک محدود نہیں بل کہ ان کی دلی تمناؤں اور اُمنگوں کو محسوس کر کے کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔''

پریم ناتھ پردیسی نے کشمیر کے پسماندہ طبقوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکا ان کے شعور کی گھتیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔اس طرح ان کے افسانوں میں فضا کی ایک تازگی اور بیان میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔سہیل عظیم آبادی جو خود بھی ایک افسانہ نگار ہیں نے پردیسی کے افسانوں میں اس خصوصیت کو نمایاں دیکھ کر لکھا ہے کہ'' پردیسی کی زندگی کشمیر کے لئے تھی'' ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ''ان کا فن کشمیر کے لئے تھا''،کشمیر کے حسین مناظر، یہاں کے انسانوں کی ذہانت اور عوام کی زندگی کے نشیبوں اور فرازوں کو پردیسی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی انسانی نفسیات کی تہوں کو کھولنے کی جو کوشش کی ہے وہ ان کے عہد کے فنی رچاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔افسانہ'' دھول'' جو پری محل کے تاریخی کھنڈر اور ڈل کی شاداب فضا کی رنگا رنگ زندگی کے اطراف میں گھومتا ہے پردیسی کے نمائندہ افسانوں میں سے ہے۔جس کے تانے بانے میں ایک غریب میاں بیوی کی زندگی کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔

پردیسیؔ کے کئی افسانے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں مثلاً جنت جہنم ،جھنڈ یاں ،دھول اور بہتے چراغ ۔اردو افسانے میں انہوں نے جو خصوصیت حاصل کی ہے اس

لحاظ سے کوئی تعجب نہیں کہ وہ عام طور پر ''کشمیر کے پریم چند'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اپنے فن میں اپج پیدا کرنے کا رجحان جہاں انھیں بیان کے نئے نئے انداز اختیار کرنے پر ابھارتا ہے وہیں انھیں نئے نئے تجربوں کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال انھوں نے پنجاب کے ایک افسانہ نگار رنبیر سنگھ ویرؔ کی شرکت میں ایک افسانے کی تکمیل کی تھی اس کا ابتدائی حصہ ویر جی نے لکھا تھا اور اسے ایسے موڑ پر چھوڑا تھا جہاں سے بیانیہ کو آگے بڑھانے کے لئے کئی راہیں سجھائی دیتی تھیں بعد کے حصے کی تکمیل پردیسی نے کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے سلسلے کا انجام اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ افسانہ مارتنڈ کے شمارہ ۱۹ اپیل ۱۹۳۸ کو اس کوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

''اس کہانی کا پہلا حصہ پنجاب کے مشہور افسانہ نویس شری پت رنبیر سنگھ ویر نے لکھ کر پردیسی کو واپس دیا تھا جس نے کہانی کو مکمل کر دیا۔ رنبیر جی کی یہ ہدایت تھی کہ شالنی کا کریکٹر بلند رکھا جائے۔ آپ کہانی پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ ویر جی کی یہ ہدایت کس حد تک پوری کی گئی اور جس مقام پر ویر جی نے کہانی کا بیک گراؤنڈ پیدا کیا اگلا حصہ لکھنے والے کے لئے کتنا مشکل تھا۔''

(اخبار مارتنڈ، شمارہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ سرینگر)

کہانی کے ابتدائی حصے میں ویر جی نے شالنی کے اطرافِ راز کی ایک گہری فضا پیدا کی تھی وہ اپنے دس چاہنے والوں میں سے ہر ایک کو رات کے تین بجے ایک مندر میں ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔ اسی مقام پر کہانی ادھوری چھوڑی گئی تھی۔ پردیسی نے راز کی فضا کو اور گہرا بنایا اور ایسا انجام پیدا کیا کہ شالنی کا کردار ایک دیوی کا کردار بن گیا۔ اس طرح پریم ناتھ پردیسیؔ نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصی مقام حاصل کیا ہے۔

☆☆☆

Qaumi Yakjehti bich Pahadi Zaban-o-Adab Na Kirdar by Dr. Sajid Muneer(Dept. of Gojri & Pahadi BGSBU, Rajouri)cell-7006541695

**ڈاکٹر ساجد منیر** (شعبہ گوجری، پہاڑی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری)

# قومی یکجہتی بچ پہاڑی زبان وادب نا کردار

کسے وی قوم نی سیاسی، سماجی ہور ثقافتی ترقی بچ زبان اک کلیدی عنصر نی حیثیت رکھنی ہے۔ زبان محض اک ترسیلی وسیلہ نیہہ بلکہ قومی وحدت، تاریخی تسلسل ہور اجتماعی شعور نی علامت وی ہونی اے۔ برصغیر ہندو پاک بچ ماہرین لسانیات نے مطابق تقریباً 1080 نیکیاں بڑیاں بولیاں بولی جانیاں ہین جنہاں بچوں سینکڑیاں بولیاں باضابطہ مکمل زبان نی شکل اختیار کری گیاں ہین تہ انہاں زباناں بچ اک زبان ''پہاڑی'' وی اے جیہڑی تقسیم ہند تھیں پہلاں اک پچھڑی نی کمزور جئی بولی نے طور ور جینی سی۔ حالانکہ اس نیاں جڑاں زبان نی قدیم تاریخ بچ موجود رہیاں ہین تہ اس نا ذکر قدیم تاریخاں بچ جلی حرفاں نال آیا اے۔

ہندو تے بدھ مت نے تذکریاں بچ اس نی شناخت مشہور تاریخی ماٗخذ ''شاردہ'' نے حوالیاں نال ہونی ہے جیہڑا انہاں دوّاں مذہباں نا اک بڑا اسکول رہیا اے تہ اس کی یونیورسٹی نا درجہ حاصل سا۔ ''شاردا پیٹھ'' ناں نی اس یونیورسٹی بچ جیہڑے مضمون پڑھائے جانے سن انہاں نا رسم الخط ہور میڈیم ''لپّی'' یعنی پہاڑی زبان سا۔ اس رسم الخط بچ ہزاراں کتاباں بکھ بکھ علوم وفنون اور مضموناں اُپر لکھی گئیاں سن۔ انہاں نے بارے تذکریاں بچ ذکر کیتا گیا ہے مگر انہاں لکھتاں نا کوئی نسخہ سوائے کجھاں کتبیاں نے موجود نیہہ۔ ایہہ تحریری نمونے ابتدائی زمانے نے ہتھاں مٹ گئے ہین مگر انہاں نے نقوش پتھراں تے سِلاّں اُپراج وی لبّی جانے ہین۔ کجھ نمونے ٹیکسلا تے لاہور نے عجائب خانے بچ موجود ہین اس تھیں علاوہ سری نگر نے ایس پی ایس میوزیم بچ وی دو کتبے محفوظ ہین جنہوں نے بارے آکھیا جانا ہے کہ قدیم کشمیری زبان وی ایّو لپّی زبان سی جیہڑی انمیں صدی نے آخر توڑی رائج رئی۔ جس لپّی کی اسیں پہاڑی آکھنے ہاں اس کی لہندا تہ ٹاکری وی لکھیا گیا ہے جیہڑی دیوناگری نال وی مشابہت رکھنی اے۔

آ کھنے ہین کہ تاریخ اپنے آپ کی دہرانی اے تہ ہزاراں سالاں تکر کھا تا بند رہن تھی بعد لسانی تحقیق نے مراکز فِر کھلے تے ان مراکزاں وچ پہلیاں سڑیاں تے گمگشتہ زباناں کی فِرزندگی عطا ہوئی ہور نویں دور نے اعلیٰ تعلیم یافتہ محققاں تہ دانشوراں پرانے ماخذاں نی مدد نال زباناں نے بارے قابلِ قدر معلومات جمع کیتیاں ہور مختلف شواہداں نی مدد نال پہاڑی زبان فرتوں وجود نچ آئی۔ اگر پہاڑی زبان نے بارے گل کرن تے اج اِس زبان کی بولن آلی آبادی تقریباً پنج (5) کروڑ اے۔ پہاڑی زبان اپنے ترے (3) لہجیاں نچ بولی جانی اے جنہاں نچ ہندکو، پھوٹواری تہ پہاڑی لہجے مشہور ہین۔ پھوٹواری لہجے نچ بولنے آلے لوکاں نی آبادی تقریباً ترے (3) کروڑ اے۔ ہندکو ہور پہاڑی لہجے بولنے والے لوک تقریباً اک اک کروڑ ہین۔

اساں نی ریاست جموں کشمیر نچ پہاڑی زبان نے علاقیاں وچ راجوری، پونچھ، بارہمولہ، اوڑی، بونیار، کپواڑہ، کرناہ، لار، کنگن، انت ناگ، باندی پور، شوپیاں وغیرہ شامل ہین۔ انہاں علاقیاں نچ پہاڑی زبان بولنے آلیاں نی تعداد تقریباً 20 لاکھ ہے۔ ریاست جموں وکشمیر نے انہاں علاقیاں نچ پہاڑی زبان وادب نا تخلیقی ہور تحقیقی کم پچھلیاں تریّاں چالیاں (30,40) سالاں توں کافی زور وشور نال وجود نچ آ رہیا اے ہور صرف کتاباں نی شکل نچ ہی لٹریچر سامنے نیہہ آیا بلکہ اتھوں نی نجی تہ ریاستی سرکار نی کاوشاں نال پہاڑی پروگراماں کی ریڈیو ہور ٹیلی ویژن اُپر وی ٹیلی کاسٹ کیتا جانا ہے جس نے وجہ نال پہاڑی نی نشر واشاعت نا نیٹورک بہت بڑا ہو گیا اے۔ ریڈیو کشمیر تے دور درشن سری نگر نے چینل تقریباً 26 ملکاں نچ سنے اور دیکھے جانے ہین۔ پہاڑی موسیقی وی کافی مشہور ہو رہی ہے۔ اج پہاڑی نے گلوکار مختلف تقریباں وچ اپنے کرتب دسنے ہین ہور انہاں نیاں آڈیو تے ویڈیوز سوشل میڈیا نی مدد ن کافی مقبولیت حاصل کرنیاں ہین۔ پہاڑی زبان وچ فیچر فلم ''لکیر'' منظرِ عام اُپر آئی لکھاں لوکاں کولوں دادِ تحسین کیتا ہے۔ پہاڑی زبان، ادب تے کلچر نے فروغ نچ ساریاں تھی زیادہ کم جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی نے کیتا ہے۔

کلچرل اکیڈمی وچ پہاڑی شعبے نا قیام 1978 نچ وجود نچ آیا۔ اج ایہہ شعبہ پہاڑی زبان تہ ادب نا اک خودمختار شعبہ اے جس بچوں اج توڑی سینکڑیاں کتاباں شائع ہو کے منظر عام اُپر آ گئیاں ہین۔ اسے شعبے توں ''آستا ادب'' ہور ''شیرازہ'' ناں نے رسالے وی بڑے اچھے طریقے نال پہاڑی زبان وادب نی آبیاری کر رہے ہین۔ کلچرل اکیڈمی تو پہاڑی زبان وادب نے نثر ونظم نی تقریباً ہر اک صنف اُپر کتاباں شائع کیتیاں جا رہیاں ہین۔ اس تھیں علاوہ دویاں زباناں نے عالمی

شہرت یافتہ مضامین تے ادیباں نیاں اہم کتاباں نے ترجمے بھی ہور ہے ہین۔ پہاڑی نی کتاباں اُپر انہاں نے لکھاریاں کی آٹھ مرتبہ بیسٹ بک ایوارڈ بھی دتے گئے ہین۔ ایہہ ایوارڈ ہن اک لکھ روپے نقد تہ اسناد اور شال پر مبنی ہین۔ جنہاں ادیباں تہ شاعراں نی مالی حالت ذری کمزور اے انہاں کی کتاباں چھاپنے واسطے 66 فیصدی سبسڈی بھی دتی جانی اے۔ انہاں تھی علاوہ جموں کشمیر اکیڈمی آف ارٹ کلچر اینڈ لینگویجز ریاست نے مختلف علاقیاں بچ پہاڑی کلچرل پروگراماں ہور کانفرنساں منعقد کرنی ہے جنہاں بچ ہزاراں مرد تے کڑیاں شریک ہونے ہین تہ اپنی ماں بولی نیاں بنیاداں مضبوط بنانے ہین۔

ہن اگر اس گل کراں کہ قومی یکجہتی بچ پہاڑی زبان نا کیا کردار اے تہ سب تو پہلاں اساں کی پہاڑی زبان وچ قومی یک جہتی نا مفہوم سمجھنا پیسی۔ قومی یکجہتی توں مراد ہندوستان یعنی اساں نے پیارے ملک نی ایکتا اے۔ قومی یکجہتی کثرت وچ وحدت نا ناں اے۔ جس نی وجہ نال ساری قوم اک لڑی وچ پروئی جاسکنی اے۔ سماجی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی، لسانی، مقامی ہور مذہبی اختلافات کی ختم کری پوری قوم اور ملک کی اک سطح اُپر لانا قومی یکجہتی کہلانا ہے۔ جسراں کہ اس جاننے ہاں ہندوستان اک بہت بڑا ملک ہے، اس نیاں بکھ بکھ ریاستاں بچ ہر رنگ، مذہب، قوم، قبیلے ہور نسل نے لوگ رہنے ہین، انہاں لوکاں نے اپنے اپنے رسم ورواج، زباناں، کھانے پینے، رہن سہن نے طور طریقے ہین۔ اس واسطے ملک نے ترقی اور قومی اتحاد واسطے جذباتی ہم آہنگی ہور قومی یکجہتی لازمی اے۔ قومی یکجہتی نال ہی اساں نا ملک ترقی تہ عروج نے راستے اُپر گامزن ہوسی۔ جمہوریت نے بقا واسطے وی قومی یکجہتی نی بہت لوڑ اے۔ ملک بچ امن وسکون کی برقرار رکھنے واسطے قومی یکجہتی بہت ضروری ہے، اس نال لوکاں وچ دیانتداری، تندہی، احساسِ ذمہ داری، احساس خدمت گزاری ہور نظم وضبط نا جذبہ پیدا ہونا اے جیہڑا امن وسکون نی زندگی واسطے ضروری ہے۔

ہن سوال یہ پیدا ہونا ہے کہ پہاڑی زبان وادب وی قومی یک جہتی واسطے کجھ کیتا اے یا نیہہ۔ اس اگر پہاڑی زبان نے شاعراں نے کلام نا مطالعہ کراں تہ اساں کی بہت ساری مثالاں انہاں نی شاعری وچ نظر اچھنیاں ہین جنہاں بچ قومی یک جہتی ہور حب الوطنی نے جذبات کوٹ کوٹ کر پرے نے ہین۔ انہاں جذباتاں اُپر مبنی پہاڑی نے ایک مشہور شاعر محمد اقبال خان منجا کوٹی نی نظم ''گاندھی جی'' نے کجھ اشعار ملاحظہ کرو:

چنگے مندے سب انسان　　　سب نی اُچی اپنی شان

ایشور اللہ تہ بھگوان ناں تہ بکھرے اِکّو جان
ہر کتاب اے فرماندی
کہہ کمال دکھایا گاندھی

ہندو، مسلم، عیسائی نا دیش گورے کالے پہنائی نا دیش
ابوالکلام، نانک، نہرو اے رانی لکشمی بائی نا دیش
دیش نی رکشا فوج بناندی
کہہ کمال دکھایا گاندھی
(نظم: گاندھی، محمد اقبال خان منجاکوٹی)

انہاں شعراں نچ قومی یکجہتی ہور حب الوطنی نے جذبات کی دیکھیا جائی سکنا ہے۔ شاعر آکھنا اے کہ اے ملک ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی نا اے ہور اس نچ کسے گورے کی کالے اُپر ترجیح نی دتی جاسکنی، کیّاں کہ اے ملک سبّاں واسطے برابر ہے اور اِتھا سب ملی جلی رہنے ہین۔ اسے طراں انہاں نیاں ہور بھی بہت ساریاں نظماں قومی یکجہتی نا درس دینیاں ہین۔ نظم ''چھنڈا'' نے کجھ بند ملاحظہ کرو:

ہے ایہہ چھنڈا ہندوستانی آزادی نی فل کہانی
سدا ہوا نچ چھلنا رہسی جمہوریت نی ایہہ بڑی نشانی
تسائیں دہساں میں زبانی
ہے ایہہ چھنڈا ہندوستانی
ہے اک رنگ اسنا چٹّا گورا چھوڑو بولو مِٹّھا
تو اہڑا ماہڑا الہو بدن نا اِکّو رنگ نا سواڈِ ٹھا
فر تو تو میں میں خصمائیں کھانی
ہے ایہہ چھنڈا ہندوستانی
ہے اک رنگ اس نا بھورا اپنا فرض نبھایو پورا
ہندو مسلم سکھ عیسائی پیار نا رشتہ رکھیو گوہڑا
دُدھ پلاؤ کوئی منگے پانی
ہے ایہہ چھنڈا ہندوستانی

چنڈے نال لٹکی ڈوری ایکتا رکھیو قیامت توڑیں
مت کوئی دوروں آنی دوڑی کم گمائی جائے چوری چوری
اج کل نی دنیا دنیائی کھانی
ہے ایہہ چھنڈا ہندوستانی
(نظم: چھنڈا اقبال خان منجا کوٹی)

انہاں شعراں بچ قومی یکجہتی نا درس لبنا اے ہور آپس وچ ملی جلی رہنے دی تلقین کیتی جا رہی اے۔ اقبال خان ہوراں نیاں انہاں نظماں تھیں علاوہ وی بہت ساریاں نظماں ایجیاں ہین جیہڑ یاں حب الوطنی ہور قومی یکجہتی نا سبق دینیاں ہین انہاں بچ نظم 15 اگست، ہور نظم 26 جنوری وغیرہ قابل ذکر ہین۔ اقبال خان ہوراں تھیں علاوہ شیخ ظہور ہوراں ناناں وی پہاڑی شاعری بچ اُچا مقام رکھنا اے۔ انہاں وی اپنی شاعری بچ جا بجا حب الوطنی ہور قومی یکجہتی نا پیغام دتا اے۔ اپنی اک غزل وچ اس طرح آ کھنے ہین:

وطنیو ماڑ یو بس صبر رکھیو سارے سُر بچ رباب ہوسن گے
پہائی چارہ، پیار تہ الفت فِر واپس جناب ہوسن گے
(برفاں نے سیک، (شیری مجموعہ)، شیخ ظہور، صفحہ: 119)

القصہ مختصر پہاڑی زبان وادب نے تقریباً ہر اک شاعر نے اپنی شاعری بچ آپسی محبت تہ پ ائی یچارگی نا پیغام دتا اے ہور حب الوطنی تہ قومی یکجہتی نے جذبات انہوں نے شاعری بچ جا بجا نظر اچھنے ہین۔ جس طراں کہ اُس جاننے ہاں کہ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی نا دور اے ہور اِس دور بچ زندگی بہت تیز رفتار ہوگئی اے۔ اساں نا پیارا ملک ہندوستان وی روز بروز ترقی نیاں منزلاں طے کر رہا ہے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی ہور معاشی سطح اُپر آئے روز ترقی تہ عروج نیاں کئی خبراں اُساں کی سننے واسطے لبنیاں رہنیاں ہین۔ تعلیمی سطح پر وی سرکار نویاں نویاں سکیماں اساں واسطے لانچ کر رہی اے۔ اسے سلسلے بچ نیشنل ایجوکیشن پالیسی (NEP-2020) نے تحت علاقائی زباناں کی فروغ دینے واسطے زور دتا گیا اے۔ اس پالیسی نا مقصد نظامِ تعلیم کی بہتر بنانا ہور مادری زباناں کی فروغ دینا اے۔ نیشنل ایجوکیشن پالیسی (NEP-2020) اس گل ور زور دینی اے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان یا علاقائی زبان بھی دتّی جائے جس نی وجہ نال بچہ بہتر طریقے نال ضروری نقطیاں کی سمجھی سکنا اے۔

نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020 مادری زبان و ادب کی فروغ دینے واسطے سرکار نے طرفوں اک تحفہ اے۔ ہن اساں کی ایہہ چاہناں اے کہ اپنی مادری زبان کی فروغ دینے واسطے اس تحفے کی قبول کراں ہور اپنے کراں بچ پہاڑی ماحول تیار کراں، اپنے بچیاں کی پہاڑی زبان لکھنا ہور پڑھنا سکھالاں، اس تھیں علاوہ اساں نی اے ذمہ داری بنی اے کہ پہاڑی کتاباں ہور رسالے وغیرہ خرید کے پڑھاں اور تعلیم یافتہ نوجواناں بچ بہاڑی سکھنے نی آمادگی پیدا کراں، پہاڑی محفلاں، نشستاں ہور محلیاں بچ پہاڑی ریڈنگ روم قائم کرنا وی وقت نی ضرورت اے۔ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی نے اُس شکرگزار ہاں کہ انہاں گوجری تہ پہاڑی پی۔ جی پروگرام نا انعقاد کری اساں نی مادری زباناں کی اک پلیٹ فارم مہیا کیتا ہے۔ اس جموں کشمیر نی سرکار اگے گزارش کرنے ہاں کہ اسے طرح ریاست نیاں دویاں یونیورسٹیاں بچ وی پہاڑی شعبے قائم کیتے جان ہور اس نے نال نال اسکولاں ہور کالجاں بچ پہاڑی مضمون کی پڑھنا لازمی قرار دتا جائے۔ آخر بچ میں ایہہ آکھنا چاہنا آں کہ پہاڑی زبان خطہ پیر پنجال نے دیش بھگت لوکاں نی مِٹّھی زبان اے ہور اس بچ بڑے زور وشور نال بہترین ادب تخلیق ہور ہیا اے جس بیچ حبّ الوطنی ہور قومی یکجہتی کوٹ کوٹ کر پری نی اے۔

**معاون کتاباں:**

۱۔ دو ماہی شیرازہ پہاڑی، جلد 45 شمارہ 3
۲۔ محمد اقبال خان منجا کوٹی نی نظماں
۳۔ برفاں نے سیک (شعری مجموعہ) از شیخ ظہور
۴۔ جموں کشمیر کے پہاڑی لوگ: زبان معیشت اور مسائل ایک جائزہ مرتبہ: نظیر احمد مسعودی
۵۔ دو ماہی شیرازہ پہاڑی، زبان وادب نمبر از جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز
۶۔ اردو گرامر

☆☆☆

Pahadi Zaban Na Aghaz tah Irteqa : Ek sasari Jaeza by Dr. Sajid Muneer((Dept. of Gojri & Pahadi BGSBU, Rajouri)cell-7006541695

**ڈاکٹر ساجد منیر** (شعبہ گوجری، پہاڑی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری)

# پہاڑی زبان نا آغاز تہ ارتقا: اک سرسری جائزہ

بولنے، گل کرنے ہور اپنے احساساتاں تہ جذباتاں کی دوّے تک پہنچانے نے صوتی ہور لفظی وسیلے کی زبان آکھیا جانا اے۔ زبان کسے وی علاقے نچ بسنے آلے لوکاں نی پہچان نا ذریعہ ہونی اے۔ ایہہ زبان ہی اے جس نی وجہ نال اس اک دوّے کی اپنیاں پریشانیاں ہور دکھ سکھ دسّی سکنے ہاں۔ ماہرین لسانیات نے مطابق پوری دنیانیاں زباناں اٹھ بکھ بکھ خانداناں بچوں تخلیق ہوئیاں ہین۔ انہاں خانداناں بچوں ہند یورپی اک ایہجا خاندان اے جس بچوں برصغیر ہندو پاک نیاں جدید زباناں وجود نچ آئیاں ہین۔ برصغیر نیاں دوّیاں بڑیاں زباناں بچوں ''پہاڑی'' وی اک زبان ہے جس نا تعلق ہند یورپی خاندان نے ہند آریائی نسل ہور ہند آریائی نسل نے پشاچی گروہ نال اے۔ موجودہ پہاڑی زبان جس نے بولنے آلے ہندوستان تہ پاکستان نے مختلف پہاڑی علاقیاں وچ بسنے ہین، جنہاں نی کل آبادی پنج کروڑ تھیں زیادہ اے، ایہہ زبان مختلف علاقیاں وچ معمولی جے بکھ بکھ لہجیاں نال بولی جانی اے لیکن اس نی تاریخ کافی پرانی اے۔ آکھیا جانا اے کہ پرانے زمانے نچ ہندو تہ بدھ مت نے مذہباں نی تعلیم راجہ اشوک نے دور وچ اسے پہاڑی زبان نچ دتّی جانی سی۔ راجہ اشوک نا دور پہاڑی زبان نی تاریخ وچ ایک سنہری دور منیا جانا اے، کیّاں کہ اس اپنے مذہبی پرچار واسطے ''شاردہ پیٹھ'' ناں نی اک یونیورسٹی قائم کیتی سی ہور اس یونیورسٹی وچ جیہڑے مضمون پڑھائے جانے سن انہاں نا رسم الخط ''لپی'' یعنی ''پہاڑی'' زبان سا۔ اس رسم الخط نچ بہوں ساریاں کتاباں اس زمانے نچ تخلیق کیتیاں گیّاں سن جیہڑیاں وقت نے نال ضائع ہو گئیاں لیکن انہاں نے کجھ نقوش اج وی کجھاں عجائب خانیاں نچ پتھراں تہ سلّاں اُپر نقش کیتے نے نظر اچھنے ہین۔

ہن اگر اس گل کراں اس زبان نے آغاز تہ ارتقا اُپر تہ اس سلسلے نچ زباناں نا علم رکھنے آلیاں اپنے بکھ بکھ نظریے پیش کیتے ہین۔ مشہور ماہرِ لسانیات گریرسن نے مطابق پہاڑی زبان ہند

آریائی نے ''پشاچہ'' گروہ توں نکلی اے۔اس نا آکھنا اے کہ پہاڑی بولن آلے اک ''کھاشا'' مغربی علاقیاں نیاں بستیاں توں نکل کے مشرقی علاقے آلیاں بستیاں بچ آ بسے ہور اتھوں نے بسنیک ہوئی گے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہوراں نے مطابق جنوب مغربی گروہ نیاں زباناں بچ راجستھانی بولیاں توں علاوہ پہاڑی گروہ نیاں بولیاں وی شامل ہین ہور ایہہ بولیاں ''کھاشہ'' قبائل بچ رائج سن جیہڑیاں ہمالیہ نے پہاڑی علاقے بچ مغرب توں مشرق تک پھیلیاں نیاں ہین۔

اک مشہور ماہر لسانیات مسٹر بین ہوراں نے مطابق پہاڑی زبان ہند آریائی زباناں نی اک شاخ اے۔مسٹر بین ہوراں پہاڑی زبان کی ترے (3) حصے بچ بنڈیا اے (1) مشرقی پہاڑی (2) وسطی پہاڑی ہور (3) مغربی پہاڑی۔مشرقی پہاڑی نیپال ہور گورکھپوری بچ بولی جانی اے۔ وسطی پہاڑی یو۔پی نے درمیانی علاقیاں بچ بولی جانی اے یعنی گھڑوال جس کی مقامی لوگ گھڑوالی آکھنے ہین۔مغربی پہاڑی پنجاب توں لئی جموں کشمیر نے آر پار توڑی بولی جانی اے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری ہوراں ''پشاچی'' نی حمایت کیتی اے۔انہاں لکھیا اے کہ پشاچی زمرے نیاں زباناں بچ اک زبان ''لہندا'' وی اے جیہڑی سرگودھا، راولپنڈی، ملتان ہور بلاول پور نے علاقیاں بچ بولی جانی اے۔ایہہ زبان پہاڑی نے پوٹھواری لہجے نے قریب اے۔ریاست جموں وکشمیر نے مشہور نقاد یوسف ٹیگ ہوراں نا آکھنا اے کہ پہاڑی بولنے آلے لوک اس گندھار کلچر نی وراثت ہین جس وچ چندر گپت موریا جئے بادشاہ پیدا ہوئے مگر افسوس نے گل اے کہ اس عظیم گندھار کلچر نے حفاظت پہاڑی لوک نیہہ کر سکے۔پہاڑی زبان نے ایک مشہور ادیب خوش۔دیو مینی ہوراں نا آکھنا اے کہ اس زبان نی پرچول تو پتہ چلنا اے کہ ایہہ زبان شہنشاہ اشوک نے دور وچ وی بولی تہ سمجھی جانی سی۔ اس تھیں علاوہ راجہ نذر بونیاری ہوراں پہاڑی کی پشاچی نی اک شاخ آکھیا اے۔

انہاں ساریاں نظریات توں ثابت ہونا ہے کہ پہاڑی زبان اک ہند آریائی ریائی زبان ہے جس نا تعلق ہند آریائی نے ''پشاچی'' خاندان سنگ جا ملنا اے ہور اس زبان نا آغاز راجہ اشوک نے زمانے تھیں لبنا اے۔اج پہاڑی زبان جس نے بولنے آلے پیر پنچال نے پہاڑی علاقیاں تو علاوہ ایل او سی (LOC) تھیں بارلے علاقیاں بچ وی اک بڑی تعداد موجود اے جیہڑی اس زبان نی ترقی تہ عروج واسطے ہر ممکن کوشش کر رہی اے۔

اگر اس صرف ریاست جموں وکشمیر نی گل کراں تہ پہاڑی زبان راجوری، پونچھ، بارہ مولہ، اوڑی، بونیار، کپواڑہ، کرناہ، لار، کنگن، اننت ناگ، بانڈی پور، شوپیاں وغیرہ نے علاقیاں بچ

بولی جانی اے ہور انہاں علاقیاں نچ پہاڑی زبان بولنے آلیاں نی تعداد تقریباً 20 لاکھ تھیں زیادہ ہے۔ ہندو پاک نے پہاڑی علاقیاں نچ ایہہ زبان اپنے ترے (3) مشہور لہجے رکھنی اے، جنہاں نچ ہندکو، پھوٹواری تہ پہاڑی لہجے قابل ذکر ہین۔ ہندکو لہجہ بولنے آلے لوکاں نی تعداد تقریباً ترے 3 کروڑ اے جبکہ اک اک کروڑ پوٹھواری تہ پہاڑی لہجیاں وچ گل کرنے ہین۔

**پہاڑی زبان وادب نا ارتقا:**

اگر پہاڑی زبان وادب نے ارتقائی گل کراں تہ چوتھی پنجمی صدی توں لے کے بیہی صدی تکر پہاڑی زبان اپنے لوک ادب نے ذریعے چلنی رہی۔ لوک ادب توں مراد اوہ ادب اے جیہڑا تحریری صورت نچ نیہہ ہونا جبکہ سینہ بہ سینہ اساں نے بزرگاں نے ذریعے لوک کہانیاں تہ لوک گیتاں نی صورت ٹرنا رہیا۔ ایہہ سلسلہ تقریباً تقسیم ہندتوڑی جاری رہیا تہ فر کجھ پہاڑی لکھاری میدان نچ آئے ہور اس زبان نچ ادب تخلیق کرنے لگے لیکن باقاعدہ طور ور کوئی پلیٹ فارم دستیاب نہ ہونے نی وجہ نال اے لوک اردو زبان نچ لکھنے رہے۔ ایہہ سلسلہ وی آہستہ آہستہ 1978 تکر چلنا رہیا۔ پہاڑی زبان وادب نی ترقی نا اصل دور 1978 تھیں بعد شروع ہویا جدوں کلچرا کیڈمی نچ پہاڑی شعبہ قائم کیتا گیا۔ 1978 تھیں اس شعبے کم کرنا شروع کیتا ہور پہاڑی زبان وادب نا پہلا رسالہ ''پہاڑی شیرازہ'' شائع ہویا۔ اس رسالے نچ جموں کشمیر نے نمائندہ ادیباں تہ شاعراں نیاں پہاڑی تخلیقاں شامل کیتی گئیاں۔ انہاں لکھاریاں نچ کریم اللہ قریشی، نوراللہ قریشی، راجہ نذر بونیاری، مصطفی پونچھی، اقبال عظیم، ہور نثار راہی وغیرہ شامل سن۔ ایہہ سارے لکھاری پہاڑی شعبے نے بنیاد گزار ہین۔ 1978 توں شروع ہونے آلا ایہہ شعبہ اج 205 تکر برابر کم کر رہیا اے ہور بہت سارے پہاڑی لکھاری کلچرل اکیڈمی تو شائع ہونے آلے رسالیاں تہ کتاباں نچ بکھ بکھ صنفاں اُپر کم رہے ہین۔ ایہہ سلسلہ پچھلیاں تری چالی (30-40) سالاں توں چل رہیا اے ہور صرف کتابی صورت نچ ہی پہاڑی زبان وادب نی ترقی تہ ترویج نیہہ ہو رہی بلکہ ریاستی سرکار نی مدد نال پہاڑی پروگراماں کی ریڈیو تہ ٹیلی ویژن اُپر وی ٹیلی کاسٹ کیتا جا رہیا اے۔

کلچرل اکیڈمی توں ''شیرازہ'' تہ ''استاادب'' ناں نے دو رسالے بڑے چنگے طریقے نال پہاڑی زبان وادب نی ترقی دے رہے ہین۔ کلچرل اکیڈمی توں پہاڑی زبان وادب نے نثر ونظم نی تقریباً ہر اک صنف اُپر کتاباں شائع کیتیاں جا رہیاں ہین۔ اس تھیں علاوہ دوییاں زباناں نے عالمی شہرت یافتہ مضامین تہ ادیباں نیاں اہم کتاباں نے ترجمے وی ہو رہے ہین۔ انہاں تو علاوہ جموں و

کشمیر کلچرل اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز ریاست نے بکھ بکھ علاقیاں وچ پہاڑی کلچرل پروگرام تہ کانفرنساں منعقد کرنی اے جنہاں نچ ہزاراں مرد تہ کالسریاں شریک ہوکے اپنی ماں بولی نیاں بنیاداں مضبوط بنانے ہین۔اس طرح اج جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے دور نچ اور وی بہت سارے الات پہاڑی زبان وادب نے نشر واشاعت واسطے کم کرر ہے ہین جنہاں توں اندازہ لائی جا سکنا اے کہ پہاڑی زبان وی اج ملک نیاں ترقی یافتہ زباناں نال کندے سنگ کندہ ملائی چل رہی اے ہور اس نا مستقبل بہوں روشن اے۔

☆☆☆

Nisar Rahi Na Afsana "Sanjha Lahu"na tajziya by Jahangeer-ul-Haq Khan(Research Scholar,Dept of Gojri & Pahadi BGSBU, Rajouri)

**جہانگیرالحق خان** (ریسرچ اسکالر، شعبۂ گوجری اور پہاڑی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی)

cell-7051361611

# نثار راہی نا افسانہ "سانجھا لہو" نا تجزیہ

ادب تہ تحقیق نی دنیا بچ اک بڑی شناخت رکھن آلا ناں اے نثار راہی نا اصل ناں نثار حسین ہور راہی تخلص سیا ایہہ اوہ شخصیت سن جنہاں پہاڑی تہ اردو زبان بچ نہ صرف شاعری کیتی، بلکہ افسانہ، تحقیقی ادب، تاریخ تہ ترجمے جیاں کئی میداناں بچ اپنے علم تہ قابلیت نا لوہا منوایا اے۔ نثار راہی 1941 بچ راجوری نے اک گراں دھاسن بچ پیدا ہوے۔ اس دور بچ تعلیم نے میدان بچ کجھ زیادہ وسیلے مہیا نہیہ سن، پر نثار راہی نی لگن تہ علم نی پیاس کجھ اس قدر سی کہ انہاں خود اپنیاں راہواں لوڑنیاں شروع کیتیاں۔ انہاں اپنی مونڈ نی تعلیم مڈل سکول درہال تھوں حاصل کیتی، جتھے انہاں نیاں صلاحیتاں ساریاں کی نظر آن لگ پیاں۔ بعد بچ ہائی سکول راجوری تھوں دسویں نا امتحان پاس کیتا۔ 1958 بچ انہاں نوکری اختیار کیتی، پر علم حاصل کرن نی تڑپ ختم نہیہ ہوئی۔ ملازمت نے نال نال انہاں اپنی پڑھائی وی جاری رکھی تہ 1970 بچ انگریزی بچ ماسٹرز (ایم اے) انگریزی نی ڈگری حاصل کرلئی۔ ایہہ اونہاں نی محنت تے لگن نا ثبوت سی۔

نثار راہی صرف شاعر ہی نہیہ سُن، بلکہ اوہ مورخ، محقق، ادیب، مترجم تہ اپنے علاقے نی اک بڑی شناخت سن۔ انہاں نی شاعری بچ درد، تحقیق وچ گہرائی، تہ تحریراں بچ اک خاص قسم نی حقیقت پائی جانی سی۔ انہاں پہاڑی زبان نی ترقی تہ فروغ وسطے دن رات محنت کیتی ہور اردو ادب بچ وی اپنی خاص پہچان بنائی۔ انہاں نی لکھی ہوئی تحریراں صرف الفاظ نہیہ سن، بلکہ ایہہ اپنی تاریخ، ثقافت تے معاشرت نا عکس سُن۔

تعلیم تہ ادب نی خدمت بچ 41 سال گزارن تھوں بعد 1999 بچ اوہ گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول راجوری تھوں ریٹائر ہوے۔ پر انہاں ادب تہ تحقیق نا رشتہ نہیہ چھوڑیا۔ اپنی زبان، ثقافت تہ علاقے نی ترقی لئی مسلسل کام کرنے رے۔ آخر 2023 بچ ایہہ چمکنا تارا ہمیشہ لئی غروب

ہوئی گیا۔نثار راہی نا ناں اج وی خطہ پیر پنجال نچ ادب نے حوالے نال عزت نال لیا جانا اے۔ انہاں نیاں تحریراں،شاعری تہ علمی خزانے اج وی اساں نے خطے نی پہچان ہین۔انہاں نا ناں ہمیشہ ادب تہ علم نیاں محفلان نچ عقیدت نال لیا جانا رہسی۔انہاں نے مرن توں بعد بالخصوص پہاڑی زبان وادب کی شدید کمی محسوس ہوئی۔ایڈووکیٹ الطاف حسین جنجوعہ نے مرحوم کی یاد کرنیاں ایہہ گل اکھی کہ نثار راہی صاحب اک گھنے سایہ دار ہور پھل دار درخت نی طراں سن ملنسار،خوش اخلاق،نرم مزاج، شائستگی،شگفتگی کوٹ کوٹ کے بھری وی سی پہاڑی زبان وادب نچ انہاں نی خدمات نا قابل فراموش ہین جس وسطے پہاڑی قبیلہ ہمیشہ انہاں نا مرہون منت رئیسی،،۔

نثار راہی ہوراں ملازمت نے دوران وی اپنی لیاقت قابلیت اور ذہنی صلاحیت کی باندے رکھی دے علمی تہ ادبی کام وی جاری رکھیا جہڑا آج اساں نیاں اکھاں نے سامنے اے۔اردو تو علاوہ اگر پہاڑی زبان نی گل کراں دے نثار راہی ہوراں نیاں بہت ساریاں تصانیفاں موجود ہین جہناں نچ انہاں نا اک افسانوی مجموعہ تہند وی شامل اے جس وچ کل افسانے تہ افسانچیاں کی ملائی دے انونجا (49) تعداد بنی اے اس افسانوی مجموعے نچ پہلا افسانہ (اگ) ہور اخری افسانہ ( پسھلٹ اے ہور اس افسانوی مجموعے نی اشاعت 2012 نچ ہوئی اس افسانوی مجموعے تہند کلچرل اکیڈمی نی طرفوں 2016 نچ سال 2012/13 نی بہترین کتاب نا ایوارڈ وی ملیا نثار راہی نے اس پہاڑی افسانوی مجموعی تہند نچ شامل افسانہ سانجھا لہو،، نا تجزیہ لین نی کوشش کرساں۔

اس افسانوی مجموعے نچ افسانہ سانجھا لہو،، نا شمار افسانہ ہور افسانچے نی ترتیب نے لحاظ نال 38 نمبر ور ہونا اے افسانہ سانجھا لہو نے بارے نچ ظفر اقبال منہاس ہوراں پیش گفتار نے نچ ایہہ گل لکھی اے کہہ ,سانجھا لہو،، ماہڑی نظراں نچ سب تھیں بہتر تہ اتم افسانہ اے،جس نی وجہ عام روایت تھیں ہٹ کے پیش کیتا گیا اک تصور اے۔جس نے مطابق فرقہ واریت نی بھڑکنی اگی نے نتیجے نچ کجھ بلوائی جیہڑے مذہب تہ فرقے نے ناں ورنفرت نی آگ برسانے سن،جدوں نس کے ہکن شراب خانے نچ پجنے ہیں تہ اچن چت اُنہاں نی نفسیات بدل جانی اے،نہ مذہبی تناؤ،نہ ذات پات نا بکھیڑا،سارے اک لخت صرف تہ صرف شرابی بن کے اک لڑی نچ پرو جانے ہیں۔غرض مصنف نی اک پُرخلوص کوشش اے جیہڑی واقعی قابل ستائش آئے،،۔حوالہ تہند پہاڑی افسانوی مجموعہ پیش گفتار صفحہ 13۔۔

نثار راہی نا افسانہ ,,سانجا لہو،،صرف ایک کہانی نہیں، بلکہ اک تلخ سماجی آئینہ اے جیہڑا

فرقہ واریت،نفرت ہور انسانی زوال نی بدنما حقیقت کی بے نقاب کرنا اے۔ایہہ کہانی آساں کی دسنی اے کہہ کس طراں انسان اپنے ہی جیید وجے انساناں نے خلاف تعصب ہور نفرت ناشکار ہونا اے، ہور اپنے نظریات، مذہبی عقائد یا نسلی تفریق نی بنیاد ور اک دوجے کی صفحۂ ہستی تھوں مٹانے ور تلی جانا اے۔فرقہ واریت نا کھیل ہور خون نی حقیقت،،۔

افسانے نا مرکزی استعارہ "خون" اے، جہڑا انساناں نے درمیان پائے جانے الے فرق کی واضح کرن نے نال نال اس حقیقی وحدت نی نشاندہی کرنا اے۔ کہ جس ویلے تک خون جسم نے اندر ہونا اے، اوہ اک مخصوص فرقے،قوم، مذہب یا نسل نال جڑیا ہونا اے،لیکن اوہی خون جس ویلے زمین ور گرنا اے، اوہ تمام شناختاں تھیں آزاد ہو جانا اے ہور بس "خون" رہ جانا اے۔اِیو خون جس ویلے پہلے فرقہ پرستی نا حصہ سمجھیا جانا اے، ور زمین ور گر کہہ انسانیت نی مشترکہ علامت بن جانا اے۔ایہہ اک انتہائی گہرا ہور معنی خیز تصور اے جہیڑا آساں کی ایہہ سوچن ور مجبور کرنا اے کہہ اگر مرن تھیں بعد سب برابر ہوئی جانے ہین، تہ جین بچ ایہہ فرق کیوں؟

افسانے بچ اک ہور دلچسپ ہور بامعنی استعارہ شیر ہور بکری نا اے۔ایہہ دوے فطری دشمن ہین،مگر قدرتی طور ور ایہہ اک ہی چشمے بچوں پانی پی سکنے ہین، اک ہی جگہ ور امن وسکون نال رہ سکنے ہین۔مصنف اتھے ایہہ دسنے نی کوشش کیتی ایکہہ فطری طور ور تہ جانور وی اپنے دشمناں نے نال کجھ اصولاں نے تحت زندگی بسر کرنے ہین،لیکن انسان جہڑے خود کی سب تھوں عقل مند، مہذب ہور ترقی یافتہ مخلوق سمجھنے ہین، ایہیہ اپنی انا،تعصب ہور نفرت نی آگ بچ جلی دے خود اپنے جیاں انساناں نے دشمن بنی جانے ہین۔اس کہانی نا اک اقتباس مندرجہ ذیل اے،، ,, پر خون جدوں پنڈے نالوں بکھ ہویا تہ فیر اس خون نے کسے اک فرقے کی نمائندگی نہ کیتی ، بلکہ اوہ لہو دو مظلوماں نا لہو بن کے توی نے اُس کہاٹ کی طرف جا رہیا سی ،جس پر کدے پہلے پہلے دور بچ شیر بکری نے اکھٹے پانی پیتا سی۔ پر اوہ تہ دوئے حیوان سن۔انہاں سکول بچ متیاں کتاباں وی نہیہ سن پڑھیاں نالے سیاست نے مداریاں نیاں گلاں وی نہیہ سن سنیاں۔اس نے نال ہی اوہ پسماندہ زمانے نے نال تعلق وی رکھنے سن تہ آج نا انسان زندیاں زندیاں نیڑے نیڑے نہ بسنے نی قسم کھائی رکھنے۔ایہہ سارا تماشہ اک ستم سی۔اک آگ نا انبار سی تہ دور توڑیں انساناں نی پہپڑ درندیاں نی طراں اُراں پراں ترفنی تہ بلکنی دوڑ رہی سی۔ میں ڈرنیاں ڈرنیاں اُس بزار تھیں پیچھے دو نس گیاں، پر میگی اوہ دو موتاں نا صدمہ عجیب حالت کر گیا سی،،۔ تہند پہاڑی افسانوی مجموعہ صفحہ 122

ایہہ استعارہ آساں کی ایہہ احساس دلاناں اے کہہ نفرت، دشمنی ہور فرقہ واریت انسان کی برباد کر چھوڑ نا اے حالاں کہہ فطرت بچ سب برابر ہین ہور سب وسطے اک جیے اصول کارفرما ہین۔ اگر فطری دشمن وی اک دوجے کی برداشت کر سکنے ہیں، تہ کیاں انسان کی وی انہاں مثالاں تھیں سبق لینا چاہنا۔اس افسانے بچ شراب خانہ – تعصب تھوں آزاد دنیانی علامت،،۔

کہانی بچ اک ہور بڑا دلچسپ تہ معنی خیز منظر شراب خانے نا اے۔اتھے ہر مذہب، فرقے تہ ذات نے بندے اکٹھے بیٹھے نیں، سب آپس بچ پیار محبت نال گلاں باتاں کرنے ہونے۔کوئی کسے کی فرقے یا ذات نے نال نیہہ جاننا، نہہ کوئی کسے نال نفرت کرنا اے۔اس افسانے نا اک اقتباس کجھ اس طراں اے،،۔۔,,جدوں ایہہ پہیڑ ماہڑے کول پجی تہ میں وی ڈرنے مارے اک کھلی ہٹی نے اندر داخل ہوئی گیاں۔اندر جا کے میں تکیا کہ ایہہ کوئی شراب خانہ اے ہور اس بچ دوئے فرقے نے متے سارے لوک شراب نار تار تا گلاس اوٹھاں نال لا کے گپاں مارر ہے سن۔اک میز نے سامنے دو منچلے گبرو بیٹھے سن ہور انہاں نا تعلق وی دواں مذہباں نے منن آلیاں نال سی۔کجھ گلاس بچوں رتی رتی شراب نیاں چسکیاں پہر کے میز نے اُپر جیاں جیاں رکھنا ایاں ایاں اوہ گبرواس کی چھنگی کے منہہ نال لا رہیا سی۔انہاں بچ دروازے نے باہر نی زندگی نا کوئی وی اثر نیہہ بلکہ نسلی طور پر دوئے پہرا تہذیبی طور پر وی تہ وقتی طور پر وی دوئے پہرا یا دوست بنے ہوئے ہین،،۔

تہند پہاڑی افسانوی مجموعہ صحفہ ..123

ایہہ منظر اک علامتی رنگ رکھنا اے، جیہڑا آساں نے سماج نے بناوٹے تعصّبات کی عیاں کرنا اے۔مصنف دسنا اے کہہ اصلی طور تہ ایہہ سیاست تہ سماجی دباؤ اے جیہڑا لوکاں بچ نفرت پیدا کرنا اے۔ایہی اوہ پیغام اے جہڑا کہانی نے نال جوڑیا گیا اے جے انسانیت کی نفرت، فرقہ واریت تے تقسیم نی زنجیراں تھوں آزاد کر دتا جائے، تہ سب بندے آپس بچ پیار تے شانتی نال رہ سکنے ہین۔سیاست تہ نفرت نی آبیاری: کہانی بچ اک بڑا اہم پہلو سیاست تہ بااثر طبقیاں نا کردار اے۔مصنف بڑے طریقے نال دسنا اے کہہ سیاستدان لوکاں بچ نفرت پیدا کرن، فرقہ واریت کی ہوا دین تہ آپنے مفاد لئی عوام کی تقسیم کرن بچ مرکزی کردار ادا کرنیں ہین۔ایہہ لوک اپنی سیاست کی زندہ رکھن لئی نفرت نا بیج بونے ہین۔مصنف اتھے اک کمال نا استعارہ وی پیش کرنا اے اوہ اکھنا اے کہ نفرت اک درخت ورگی اے، جیہڑی سیاستدان کھاد، پانی نال مہیا کرنے ہین تا کہہ اوہ مزید بدھے۔جس طراں اک درخت کی زندہ رکھن لئی سورج نی روشنی، پانی تہ کھاد نی لوڑ ہونی اے، اوہوییں

نفرت کی زندہ رکھن لئی سیاستداناں نیاں چالاکیاں، مذہبی تعصب تہ چھوٹے نظریے ضروری ہونے ہین۔ ایہہ حقیقت اساں نے آج نے سماج بچ وی صاف نظر اچھنی اے۔ تاریخ گواہ اے کہ دنیا بچ ہون الے زیادہ تر فسادات، جنگ تہ خون خرابے انہاں ہی طاقتور طبقیاں نی چالاں نا نتیجہ اے، جیہڑے اپنے مفاد لئی لوکاں کی آپس بچ لڑوانے ہین۔ کہٹاں لفظاں بچ ایہہ گل آکھی جاسکتی اے کہہ ایہہ کہانی آساں کی سوچن لئی مجبور کرنی اے کہہ کس طراں نفرت تہ فرقہ واریت آساں نے گلے نا طوق بنی ہوئی اے، اس تھوں چھٹکارا کس طراں لبھیا جاسی اے؟ کہانی نا سب تھوں بڑا سبق ایہہ اے کہہ انسانیت کی بچانا اے، تہ تعصب تھوں باہر اچھنا پیسی۔ ایہ کہانی آساں نے سامنے اک تلخ حقیقت پیش کرنی اے—

"سانجا لہو" صرف اک کہانی ہی نہیہ، ایہہ اک پیغام اے اک اجا پیغام جیہڑا آساں نے اندر نی سوچ کی بدل سکنا اے۔ ایہہ اساں نے اندر دیاں نفرتاں کی ختم کرن نی دعوت دینا اے تہ انسانیت کی پہلا درجہ دین نی صلاح دینا اے۔ اس کہانی تھیں ایہہ سبق ملنا اے کہہ ایہہ فرقے، ذاتاں، تہ نظریے سب وقتی ہونیاں، پر انسانیت ہمیشہ وسطے ہونی اے۔

☆☆☆

Ismat Chughtai aur Rediyayi Drame by Mohd. Yousaf Mir (Doda)

محمد یوسف میر (ڈوڈہ) cell-8082004155

# عصمت چغتائی اور ریڈیائی ڈراما

عصمت چغتائی: عصمت چغتائی کا جنم 21 اگست 1915ء میں بدایوں اتر پردیش میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی تھی، بی۔اے لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا تھا اور ان کی وفات 24 اکتوبر 1991ء میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ ریڈیو ڈرامے کے فروغ میں عصمت چغتائی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں عصمت کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ عصمت نے یوں تو افسانے اور ناول لکھ کر شہرت و مقبولیت حاصل کی لیکن ان کے ریڈیائی ڈرامے اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ ا۔انہوں نے ریڈیو اور اسٹیج کے لئے جو ڈرامے لکھے ہیں۔ وہ عوام و خواص میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں عصمت چغتائی کا شمار ان ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جو ڈرامے کے فن پر پوری مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیت پر روس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر شمیم النسا لکھتی ہیں:

''عصمت چغتائی کی فنکارانہ صلاحیت اس بات میں پنہاں ہے کہ انہوں نے ادب میں اپنے نئے مختلف تجربے اور نظریے کیذریعے عوام کو اعلیٰ ےعوام کو اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا اور اپنے الگ اسٹائل اور فنی محاسن سے اردو ادب کو بہت کچھ عطا کیا''۔

عصمت چغتائی کے دو ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے ''شیطان اور کلیاں'' شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مجموعہ "شیطان" میں چھ ریڈیائی ڈرامے شامل ہیں۔ (۱) شیطان (۲) خواہ مخواہ (۳) تصویر میں (۴) دلہن کیسی ہے (۵) شامت عمل اور (۶) دھانی بانکپن۔ اس مجموعے میں شامل ڈراما ''شیطان" دراصل ایک مرقع ہے اور یہ مرقع کرداروں کے باطنی تصادم اور باہمی کشمکش کے مابین ہے۔ اس ڈرامے میں روشن سجاد، صوفیہ اور احمد کے کردار کافی دلچسپ ہیں۔ ڈرامے میں موجود تصادم اور کشمکش کا عنصر سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس میں عصمت چغتائی نے ایسے شادی شدہ جوڑوں کی طرز زندگی کی عکاسی کی ہے جو اپنے اچھے مستقبل کے لئے فکر مند بھی ہیں۔ عصمت نے فکر و فن کا یہ کامیاب نمونہ ہے۔ ڈراما ''خواہ مخواہ''، تحلیل نفسی (فرائڈ کے نظریے) سے

متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے کرداروں کی نفسیات کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ اس میں عصمت نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان زندگی کی تلخ حقیقتوں سے تو ظاہری طور سے رشتہ توڑ دیتا ہے۔ لیکن داخلی طور پر یہ حقائق انسان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے۔ تصویر میں بھی ایک نفسیاتی ڈراما ہے۔ جبکہ ڈراما ''دلہن کیسی ہے'' اور ''شامت عمل'' جیسے ڈراموں کا شمار مزاحیہ ڈراموں کی صف اول میں ہوتا ہے۔ مجموعہ شیطان کا سب سے اہم اور مقبول ڈراما ''دھانی بانکپن'' ہے۔ اس میں عصمت نے انگریزوں کی ان فرقہ ورانہ شازشوں کو بے باک طریقے سے بے نقاب کیا ہے جو انہوں نے برصغیر ہندوپاک میں اپنے دور حکومت کے میں رچائیں۔ ساتھ ہی عصمت کا یہ ڈراما انسانی جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

عصمت چغتائی کا دوسرا ریڈیائی مجموعہ ''کلیاں" میں پانچ ڈرامے شامل ہیں جن کے نام یوں ہیں۔ (۱) انتخاب (۲) سانپ (۳) فسادی (۴) ڈھیٹ اور (۵) بنے۔ ڈراما ''انتخاب'' میں عصمت نے جنسی مسائل کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس میں انہوں نے متوسط طبقے کے لوگوں کے ذریعے اپنے خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ ''سانپ'' تین مناظر پر مشتمل ایک کامیاب ڈراما ہے۔ بقول زبیر شاداب:

''مجموعہ ''کلیاں'' کے ڈرامے ''انتخاب'' اور ''سانپ'' ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کے جنسی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عام طور پر عصمت کا ہنر متوسط طبقے کی عورتوں کے مسائل کو اجاگر کرنے میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ لیکن جو عورت کے جنسی مسائل کو وہ موضوع بناتی ہیں تو اپنی تخلیقات کو لاجواب کر دیتی ہیں''۔

عصمت چغتائی نے ''سانپ'' ڈرامے میں رفعیہ، غفار، سید اور خالدہ نامی نوجوان پیڑی کے کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا ہے۔ رفعیہ اور سید دراصل بھائی بہن ہوتے ہیں اور والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ غفار سے شادی طیہونے کے باوجود رفیعہ کے تعلقات کئی لڑکوں سے ہوتے ہیں۔ آخر میں غفار کو ٹھکرا کر ظفر کے پاس چلی جاتی ہے لیکن ظاہری طور سے تو وہ خوش ہوتی ہے۔ مگر باطنی طور پر بے چین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی کیفیات سے غفار اور ظفر بھی دوچار ہوتے ہیں۔ عصمت کا یہ ڈراما پلاٹ، کردار، مکالمہ نگاری وغیرہ جیسی خصوصیات سے پُر ہے۔ ''بنے'' اور ''ڈھیٹ'' ان کے کامیاب ریڈیائی ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے ان دو مجموعوں کے علاوہ بھی عصمت نے کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں۔ اس کی ایک بہترین مثال ان کا ڈراما

دوزخ ہے۔ جو ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی بار نشر ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ عصمت چغتائی نے اپنے ڈراموں میں سیاسی، سماجی، وعصری مسائل کو ہی جگہ دی ہے اور عورت اور اسکے استحصال پر قلم اٹھا کر اس کی حالت سدھارنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ عصمت چغتائی کے مکالموں میں برجستگی کا عنصر موجود رہتا ہے وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں سے جو مکالمے ادا کرتی ہیں وہ عام بول چال کی زبان میں ہوتے ہیں۔

ان کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ڈراموں کے پلاٹ میں دلچسپی کا عنصر ختم نہیں ہوتا۔ چونکہ ان کے ڈراموں کے پلاٹ کی مختلف لڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ریڈیائی ڈراموں کی تعمیر میں موسیقی وصوتی اثرات جیسی خصوصیات کو ملحوظ رکھا ہے۔

☆☆☆

## Afsane افسانے

Dastan-e-Muhabbat ka Aakhri seen by Noor shah (Srinagar)
نورشاہ (سرینگر) cell-9906771363

# داستان محبت کا آخری سین

پال اور پدما........ یہ دونوں نام، دونوں چہرے اب میری نگاہوں میں اُتر چکے ہیں اور مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ یہ دونوں نام، دونوں چہرے میرے اندر کی اَن دیکھی، اُداسی اور انجانی خاموشی دیکھ کر خود ہی حرف حرف بولنے لگے ہیں اور جب الفاظ بولنے لگتے ہیں تو خاموشی ٹوٹنے لگتی ہے اور کہانی وجود میں آجاتی ہے۔

کئی برس پہلے جب میں اور پال ایک ہی دفتر میں کام کر رہے تھے تو پال نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ممبئی کا رُخ کیا اور پھر اپنے قلم کے سہارے فلمی دنیا کی رنگینیوں میں رنگ گیا۔ اُس کا پہلا ہی تحریر کردہ ٹی وی سیریل........ ''جنت'' بے حد کامیاب رہا اور یہی سیریل ممبئی میں اُس کے روزگار کا ایک بڑا وسیلہ بن گیا۔ لکھتا تو وہ کشمیر میں بھی تھا، لیکن یہاں لکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک سرکاری جریدے کا مدیر تھا۔ لکھنا اور پڑھنا اُس کی صحافتی ذمہ داریوں کا حصہ تھے۔ میں بھی بحیثیت معاون مدیر اسی جریدے سے منسلک تھا، لہٰذا ہم دونوں کی ذمہ داریاں ایک جیسی تھیں۔ یوں تو ہمارے سرکاری معاملات سرکاری تعلقات تک ہی محدود تھے لیکن ذاتی، ادبی اور صحافتی دنیا میں ہماری دوستی اور ہمارے خلوص کی بڑی قدر تھی۔ ویسے پال کو کہانیاں لکھنے کو جنون تھا لیکن دوسری سرکاری مصروفیات کی وجہ سے اُس کا افسانوی جنون دبا دبا سا رہتا تھا۔ ممبئی میں اُس کا یہ جنون اُس کے قلم کی قوت بن کر خوب خوب نکھر گیا۔........ نام ملا، پہچان ملی، شہرت کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی ملا........ اُس کی ضرورت سے زیادہ۔

اور پھر ایک انہونی ہونی بن کر گھومتے گھومتے اُس کی زندگی کے دریچے میں یوں جھانکنے لگی جیسے چاندنی بے خواب آنکھوں میں محبت کا پہلا چراغ جلا کر صبح کی روشنی میں غائب ہوجاتی ہے

اور جب صبح کی روشنی حقیقت بن کر زندگی کی دہلیز پر کھڑی ہو جاتی ہے تو ایک خالی خالی سا آئینہ خانہ بھی سجا سنورا نظر آنے لگتا ہے۔ پال کے ساتھ بھی اُس کے کہنے کے مطابق کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک لڑکی کو چاہنے لگا تھا۔ شاید بے اختیار چاہنے لگا تھا۔ شاید اُس کے لئے بے حد جذباتی بن گیا تھا۔ شاید ایک انجانے لمحے میں پدما ہوا کے ایک تیز تر جھونکے کی طرح آئی تھی اور پال کے وجود کو ہلا کر سامنے سے گزر گئی تھی۔ وہ صرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

پدما سات سروں کی ملکہ تھی۔ ان سات سروں کو اپنی آواز میں سمیٹ کر جادو جگاتی تھی، مٹھاس بکھیرتی تھی، ذہنوں کو معطر کرتی تھی، مسکراہٹوں کی بارش برساتی تھی اور جب وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتی تو لگتا تھا جیسے جاگتی آنکھوں میں یادوں کی روشنی پھیل رہی ہو۔ ہاں کبھی کبھار وہ ایسا نغمہ بھی چھیڑتی کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اور پھر ایسا ہوا، پال ہر اُس محفل میں نظر آنے لگا جہاں پدما اپنی آواز کا جادو جگاتی تھی۔ پدما ہر محفل میں اُسے دیکھ کر حیران ہو جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ حیرانگی جان پہچان میں بدل گئی اور پھر یہ جان پہچان ملاقاتوں میں تبدیل ہو گئی۔ پدما فلم اسٹوڈیوز میں نظر آنے لگی۔ پال نے اُسے ایک فلم ساز سے ملایا جس کی فلم کے لئے اُس نے کہانی قلم بند کی تھی اور اس طرح پدما کی گیتوں بھری زندگی میں ایک بدلاؤ آیا۔ پدما کی آواز میں کئی گانے ریکارڈ ہوئے اور اس کی شہرت کا باعث بننے لگے۔ یہ سب ہونے کے باوجود پال اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو آواز نہ دے سکا۔ اپنے ہونٹوں کی خاموشی کو توڑ نہ سکا۔ وہ صرف اپنی سوچوں میں اپنی محبت بھری کہانی کو سجاتا اور سنوارتا۔

ایک دن پدما نے پوچھ لیا........

''پال! تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا، لیکن اپنے لئے کچھ بھی نہ مانگا........ کچھ تو کہو، کچھ تو مانگو........!

اب کی بار بھی پال خاموش ہی رہا۔

وہ اندر ہی اندر سوچتا رہا۔ اپنے من سے باتیں کرتا رہا......... ''میں تو پدما کو چاہتا ہوں اور وہ میری چاہت سے بے خبر بھی نہیں ہو سکتی۔ محبت مانگی نہیں جاتی، محبت کا اظہار کیا جاتا ہے........ پھر یہ کہنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟''

کہانی نے ممبئی میں جنم لیا تھا تو پھر کشمیر کے سبزہ زاروں تک کیسے پہنچی۔

ہوا یوں کہ پال کو کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کشمیر آنا پڑا۔ کہانی کو کبھی کبھار شوٹنگ کے

دوران ردوبدل کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کا آنا ضروری بن گیا تھا۔ ظاہر ہے ہمارے پرانے دن بھی یکبار لوٹ کر آ گئے اور قریب قریب سارا وقت ہم دونوں ایک ساتھ گزارنے لگے۔ ساری آپ بیتی، جگ بیتی ایک نئے عنوان کے ساتھ سامنے آ گئی۔ ہم نے دل کھول کر ذہن کے دریچے وا کر کے ایک دوسرے کے دامن کو اپنی نئی پرانی باتوں اور نئی پرانی یادوں سے بھر دیا۔ پدما کا ذکر کر کے وہ بے حد مسرت محسوس کرتا تھا۔ ایک میٹھی میٹھی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو چھونے لگتی۔ مجھے اپنی ساری داستانِ سنا کر پوچھنے لگا........

''تم ہی بتاؤ عادل، میں اُس سے کیا مانگوں؟''

''محبت کے بدلے محبت''

''میرے دوست! محبت مانگی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے''

''کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتی........؟''

''کبھی اظہار تو نہیں کیا''

''اظہار ضروری نہیں ہے۔ محبت کی کہانی تو آنکھوں میں بھی پڑھی جاتی ہے''

''شاید میں پڑھ نہیں پایا ہوں''

''وہ کیوں........؟''

''شاید میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں جہاں مجھے صرف اپنی ہی محبتیں اور چاہتیں دکھائی دیتی ہیں''

''محبت میں اکثر زبان کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ تم تو ایک قلم کار ہو میرے دوستؔ جب تم اپنے قلم کو اپنی زبان دیتے ہو، تو قلم خود ہی بولنے لگتا ہے........ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے میرے دوست''

''وہ کیا عادل........؟''

''بھوک اور تشنگی''

''کیسی بھوک........؟ کیسی تشنگی........؟ میں سمجھا نہیں لیکن میں نہ تو اپنے سپنوں کو ٹوٹنے دوں گا اور نہ ہی بکھرنے دوں گا۔ اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ ممبئی جا کر پدما کو بتا دوں گا اپنی بات........ اپنے دل کی بات۔ مجھے یقین ہے عادل........ میرے یار، میرے غم خوار، میری محبت کی قدر ہو گی۔ اُس کے اندر کی بات سن کر میری داستان محبت کو ابدیت ملے گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی........ اور محبت بھری ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا''۔

''اور مجھے بے حد مسرت ہوگی پال، میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گا........ محبت کی پھول لے کر........ کشمیر کے پھول لے کر! دو روز بعد پال ممبئی چلا گیا اور میں اپنی زندگی کی دھوپ چھاؤں میں مصروف ہو گیا۔صحافت کے تعلق رکھتا ہوں۔ ہر صبح سویرے مختلف اخبارات کا مطالعہ کرنا میری عادت ہے اور میری مجبوری بھی۔ ان دنوں کافی چھوٹے بڑے، نئے پرانے انکشافات اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ انکشافات دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔

اور اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ پدما اور پال کے چہرے میری نگاہوں میں کیسے اُتر چکے ہیں اور خود ہی حرف حرف بن کر بولنے لگے ہیں۔ میری خاموشی کیوں ٹوٹنے لگی ہے، میری اُداسی کیوں بڑھ رہی ہے۔آج کی اخباری خبروں میں سے ایک خبر میرے لئے بہت اہم ہے اور حیران کن بھی۔خبر آئی ہے کہ فلمی دنیا کی ایک گلوکارہ نے ایک پریس کانفرنس میں ایک معروف کہانی کار پر الزام لگایا ہے کہ اُس نے محبت کے بہانے اُس کی عصمت لوٹنے کی کوشش کی۔ شاید یہ خبر آپ کی نظروں سے بھی گزری ہوگی، یا شاید آپ نے اس کی جانب توجہ نہ دی ہو........!

اور اب میں آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں کہ اس داستان محبت کے آخری سین کے دو کردار پال اور پدما ہیں........!!

☆☆☆

Andar ki baat by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363

نورشاہ (سرینگر)

# اندر کی بات

اور جب انتخابات میں جیت حاصل کرنے کے بعد اُس نے اعلیٰ ترین کرسی سنبھالی تو اُس کی مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اُسے لگنے لگا کہ اُس کی اپنی زندگی جیسے اُس کی اپنی نہ رہی ہو۔ اب تو لمحہ بھر کے لئے بھی اُسے اپنی زندگی کے اندر جھانکنے کا ایک ذرا موقع بھی فراہم نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے ایک آندھی آئی تھی اور وہ سارے محبت بھرے شب و روز اپنی جھولی میں ڈال کر دور نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ رنگ بھرے پھول اپنی خوشبو بکھیرتے بکھیرتے جانے کب اور وقت سے پہلے ہی مرجھا چکے تھے۔ مدھر مدھر نغمے کیسے بے سُر اور بے آواز ہو چکے تھے۔ اب تو وہ زندگی کی اُن خوش رنگ اور معطر فضاؤں سے بھی دور ہوتی جا رہی تھی جن فضاؤں میں اُس نے اپنی گھر گرہستی کو محبت اور شفقت سے اپنایا تھا، سلیقے سے سجایا سنوارا تھا لیکن اب اُس گھر گرہستی کی راہوں سے باہر آ کر وہ ایک ایسی دنیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ چکی تھی جہاں شاید سب کچھ اُس کا اپنا تھا یا شاید کچھ بھی اپنا نہ تھا، یا شاید یہ اپنا ہونے یا اپنا نہ ہونے کا احساس اقتدار کی کرسی سے بندھا ہوا تھا........!

اپنے دونوں بچوں کو اپنے شہر سے بہت دور ایک ایسے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا جہاں بورڈ نگ لاجنگ کے معقول انتظامات میسر تو تھے لیکن وہ کس ماحول میں پرورش پا رہے تھے اُس کے لئے جاننا ناممکن تو نہیں تھا لیکن مشکل ضرور بنتا جا رہا تھا، کیونکہ مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں اور وقت کا دامن تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ البتہ اپنے بچوں سے دور ہوتے وقت ایک لمحے کے لئے اُس کی ممتا نے ایک ہلکی سی کروٹ ضرور بدلی تھی، لیکن یہ کروٹ سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات کے پس منظر میں جانے دل کے کس خاموش گوشے میں اب گم ہو چکی تھی۔ یہ خاموشی بھی کبھی کبھار اندر ہی اندر بولنے لگتی ہے۔ شاید اسی لئے اس خاموشی میں اکثر اس کے شریک سفر کی تصویر بار بار اُسے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا احساس دلاتی تھی کچھ جانی پہچانی، کچھ جانی انجانی ذمہ داریوں کی جانب متوجہ کرتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ بہت سارے لمحات ایک ساتھ گزارے بغیر اُن میں ادھورے پن کا احساس جاگتا اور یہ ادھورا پن نہ تو اُنہیں اچھا لگتا تھا اور نہ ہی

پسند تھا۔ایک دوسرے کی سانسوں کی مہک اُنہیں بے خود بنادیتی تھی......... اور اب یہ بے خودی اُن سے دور بھاگی جارہی تھی۔اُن کی نزدیکیاں دوریوں میں بدلتی جارہی تھیں۔اپنے شریک حیات کے ساتھ بہت سارے لمحات ایک ساتھ گزارنے کی چاہ اکثر اُس کی سوچوں کو گدگداتی تھی لیکن اب یہ ممکن نہ تھا۔اب تو اُن کی ملاقاتیں بھی کم ہوتی جارہی تھیں.........!

اور ایک دن جانے فرصت کا یہ لمحہ کیسے نصیب ہوا۔اُس نے اپنے اندر جھانکا، بہت اندر سوچوں کی گہرائیوں میں دل کی کتاب کے اوراق میں اور پھر بے آواز تو قدموں سے اپنے شریک حیات سے ملنے چلی آئی.........!

''تم یہاں،اس وقت......... بلکہ مجھے کہنا چاہیے بے وقت.........!''

''ذراسی فرصت ملی تو چلی آئی۔کچھ پوچھنے ٹھیک ہے کیا پوچھنا چاہتی ہو.........؟''

''میری مصروفیات سے تم واقف ہو۔چاہتے ہوئے بھی تم سے مل نہیں پارہی ہوں۔لمحہ لمحہ ساتھ دینا تو ممکن ہی نہیں،اس لئے.........!''......... کہتے کہتے وہ رُک گئی۔

''ہاں ہاں!رُک کیوں گئی.........!''

''یہ جاننے آئی ہوں کہ ان حالات میں،میں تمہارے لئے کیا کرسکتی ہوں.........؟''

''تم......... تم کچھ کر بھی سکتی ہو.........؟''

''ہاں!کرسکتی ہوں،بہت کچھ کرسکتی ہوں''

''مجھے یقین نہیں ہورہا ہے''

''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں.........!''

''وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو.........؟''

''تو پھر بتاؤ،کیا کرسکتی ہوں میں تمہارے لئے.........؟''

''کہوں.........!''

''ہاں ہاں کہو۔اس وقت میں تمہاری اندر کی بات سننے ہی یہاں آئی ہوں''

''تو سنو!......... میری زندگی گھر اور سرکاری کوٹھی کے درمیان لٹک رہی ہے۔میرے گھر میں سب کچھ ہے لیکن میرے بچے نہیں ہیں۔تمہاری سرکاری کوٹھی میں سب کچھ ہے،تم بھی ہو،لیکن میری شریک حیات نہیں ہے۔اس کے باوجود بھی اگر تم میرے لئے کچھ کرنا چاہتی ہو،تو ایسا کرو۔ .........!''

''ہاں ہاں، کہو''

''میرے لئے......... میرے لئے ایک ایسی خاتون کا انتظام کرو جولمحہ لمحہ میرے ساتھ رہے، لمحہ لمحہ میرا ساتھ دے اور جس کا لمحہ لمحہ صرف میرے لئے ہو......... اور میرے دو بچوں کے لئے ہو......... میری گھر گرہستی کے لئے ہو......... کیا تم ایسا کرسکتی ہو.........!!''

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلا آیا.........!!

☆☆☆

Anokha Gaahak by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

# انوکھا گاہک

نینا نے جب روز شام کی طرح آج بھی اپنے سرخ گالوں کو مزید سرخ کرنے کے لئے اس پر غازہ ملا تو اس کا ذہن ۵ سال قبل اپنی ودی کے چنار کے درختوں کی جانب چلا گیا جو خزاں کے موسم میں سرخ ہو کر دیکھنے والوں کی نظر میں خوبصورتی کی زینت تو بنتے تھے، لیکن دراصل خود وہ موسم ان کے لئے اپنے وجود کے کھو دینے کا موسم ہوتا ہے۔ایک ایسے ہی موسم کی رات جب فوجی وردی میں سرحد پار کے دشمنوں نے اس کے گاؤں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور گاؤں کے ہر گھر میں ظلم کرتے ہوئے اس کے والدین کے جسموں کو بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔اس وقت اس کے والدین نے اسے بھوسے کے ڈھیر میں چھپا کر اس کی جان تو بچا لی تھی لیکین اب وہ بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔
رفیوجی قسم کے کیمپ میں جب وہ دوسرے بے سہاروں کے ساتھ کچھ دن گزار کر اسے ایک تنظیم کے حوالے کر دیا گیا ایک رات وہ دوسرے کچھ بچوں کے ساتھ بھاگ جانے میں کامیاب ہو کر واپس اپنی وسیع وعریض وادی تو پہنچ گئی لیکن اس کو وادی پہنچانے والا استاد کھوسی لال اب زبردستی اس کی پرورش پر آمادہ تھا۔نینا کے لئے بھی اس کے علاوہ کیا چارہ تھا۔کچھ ہی دنوں کی کڑی محنت سے اس نے گانے میں مہارت حاصل کر لی اور اب وہ ریاست کی مشہور، بڑی اور مہنگی گلوکارہ تھی ،جس کی محفل تک عام لوگ تو کیا، چھوٹے موٹے رئیسوں تک کی رسائی نہیں تھی،کھوسی لال اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن دولت کی ہوس اسے گانے کے شوقین نئے نئے رئیسوں کی تلاش میں سرگرم رکھتا اور اس طرح نینا کے چاہنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔
یکا یک نیل پالش کے زمیں پر گرنے کی آواز اس کو اپنے خیالوں سے واپس لائی۔اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کھوسی لال سے رشتہ توڑ لے،لیکن دماغ کہتا تھا کہ احسان نہ بھولو، پھر دماغ پر مزید زور دینے سیا یک اور جملہذ ہن میں گونجتا ،تقدیر۔۔۔! اس کے بعد نینا کو عجیب سکون حاصل ہوتا۔'چلو کبھی تو تقدیر سنورے گی ،اگر تقدیر نہ ہوتی تو وہ بھی ایک نام ور گلوکارہ بن کر عیش کی زندگی جینے کہ بجائے کسی

کوٹھے کی زینت بھی بن سکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے' تب اس کے منھ سے برجستہ نکل جاتا۔
'دس سال کی کمسن لڑکی کے ذہن کو وقت کے حالات کس قدر پختہ اور تجربہ کار بنا دیتے ہیں۔ پانچ سال میں میری زندگی بدل گئی، لیکن ہمارے علاقے کے حالات نہ بدلے۔ حالانکہ مختلف سورتوں میں وہی دہشت، وہی وحشت۔۔۔ارے نینا تو تو فلسفی ہو گئی' یہ خیال آتے ہی اس کے منھ سے قہقہہ زار پھوٹ پڑا۔
'کیا بات ہے نینا، اس قدر تیز ہنسی'۔
نینا نے پلٹ کر دیکھا اور فلسفیانہ انداز میں بولی۔'تم کب آئے، کھوسی لال'۔
کھوسی لال نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔'ارے نینا چاچا سے سیدھا کھوسی لال'
'تم نے بھی تو مجھے کبھی بیٹی یا بھتیجی نہیں کہا۔ کیوں'؟
'وہ۔۔وہ۔۔اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں۔۔ میں' کھوسی لال کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ نینا نے زور دار قہقہہ لگایا اور کھوسی لال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ وجہہ آج ہی مجھے سمجھ میں آئی ہے۔ اس لئے میں نے آج سے اور ابھی سے تمہیں چاچا کہنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، آج سے ہم فلسفی بھی ہو گئے ہیں'۔ خیر تم بتاؤ کیسے آنا ہوا۔؟'
'تم تو جانتی ہو کہ ادھر کچھ دنوں سے جو انتشار تھا، اور جس کا اثر ہمارے کاروبار پر بھی پڑ رہا تھا، اب اسے ختم ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ نئی حکومت کل بننے والی ہے۔ اسی خوشی میں جہاں پرانی تہذیب کے مطابق مرد عورتوں کے کپڑے پہن کر فنکارانہ رقص کریں گے۔ اس پر مسرت موقع پر تمہارا گانے کا پروگرام بھی ہے، اس میں سرحد پار سے بھی مہمان شرکت کر رہے ہیں۔ غیر ملکوں سے بھی مہمان آرہے ہیں۔ اگر انھیں بھی تمہارا گانا پسند آ گیا تو قسمت چمک جائے گی'۔
'نئی حکومت کے بننے سے ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے نا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان باہر والوں کو اس میں کیوں شامل کیا گیا ہے جن کے لوگوں نے ہمارے دلوں کو اتنے زخم دئے ہیں اور مسلسل ان کی یہ کاوشیں جاری ہیں'۔
'تم تو واقعی فلسفی ہو گئی ہو۔ کون آئے گا، کس کو بلایا جائے گا، یہ تو سیاست داں طئے کرتے ہیں۔ تم ان سب چکروں میں کیوں پڑتی ہو۔ اپنے مستقبل پر نظر کرو۔ بردباری یہی ہے کہ جو کام اپنے بس میں نہ ہو، اس کی جانب ضرورت سے زیادہ توجہ نہیں کرنی چاہئے'۔
جشن شروع ہوا۔ مرد عورتوں کے کپڑے پہن کر رقص کرنے میں اس قدر مشغول ہوئے کہ لگتا تھا ان کا

اصل وجود یہی ہے۔

اس کے بعد عوام کی ترقی اور فلاح و بہبود کی قسموں سے پر تقریریں کی گئیں۔ وقفے کے بعد نیما کا گانے کا پروگرام تھا۔ جب اس کا گانہ شروع ہوا تو ہر کوئی محو ہو گیا۔ گاتے گاتے وہ مہمانوں کے آس پاس جا کر اپنی ادائے دلبرانہ سے ان کو مزید لطف فراہم کر رہی تھی۔ اسی انداز میں گاتے ہوئے وہ باہر سے آئے ہوئے ایک مہمان کے پاس پہنچی اور اس کے سامنے رکھی ہوئی ٹھنڈے کی بوتل کو پھوڑ کر اس کے سینے میں اتار دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا، باہری شخص بھی بنا کچھ سمجھے بغیر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ جشن ماتم میں بدل چکا تھا۔ نینا پولس کے شکنجے میں تھی۔ دوسرے دن نینا کے خلاف اندر اور باہر خوب نعرہ بازی ہوئی۔ باہر والے اسے حکومت کی سازش اور کچھ تحفظاتی عملے کی ناکامی مان رہے تھے تو اندر والوں میں اس کا غصہ تھا کہ اس کی وجہہ سے باہر اور غیر ملکوں میں بھی غلط تاثر گیا تھا۔ عدالت لگی، نینا سے سوال کیا گیا۔ 'وہ باہر والا میری والدین کا قاتل تھا جب پانچ سال قبل ہمارے گاؤں پر حملہ کیا گیا تھا۔ میں نے ان کا بدلہ لے لیا۔'

'لیکن تب بات اور تھی، آج وہ نہ صرف باہر کا نمائندہ تھا بلکہ حکومت کا مہمان بھی تھا۔'

'حکومتوں کو مہمان بناتے ہوئے عوام کے جذبات کا خیال رکھنا چاہئے کیونکہ انھیں حکومت عوام پر ہی کرنی ہے۔'

'لیکن یہاں کی عوام بھی تمہارے اس عمل سے بے حد خفا ہے۔ شائد تمہیں اس کی خبر نہیں۔'

'اس قسم کی عوام، حکومت اور باہر والے کیا میرے جیسی عوام کے ساتھ نظریں ملا کر ہمارے ان سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں جو ہمارے دلوں پر زخم کی صورت ابھرے اور اب جیسے جیسے ان کا علاج کیا جا رہا ہے، وہ ناسور کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں؟ ہے کوئی جواب کسی کے پاس۔'

عدالت پر سکوت طاری ہو گیا۔ سینکڑوں کی تعداد والی بھیڑ نے مانو مردہ لاشوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نینا نے ایک بار نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک شان بے نیازی سے عدالت کے ترازو کو دیکھا اور عدالت سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے اس کی ہتھکڑی کو تھام کر چلنے والے ملازم ایسے لگ رہے تھے مانو ایک زندہ روح کے پیچھے چند لاشیں۔

☆☆☆

Aab by Veshshi Syed (Srinagar) cell- 9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

# آب

’آنٹی، آپ کوتو کوئی اعتراز نہیں ہے نا میرے اورصوفی کے رشتے پر؟‘
’مجھے کیا اعتراز ہوگا بیٹا‘ جس میں میری صوفی کی خوشی، اس میں میری۔لیکن بیٹا برانہیں ماننا، تم نے اپنے والدین سے بات تو کرلی ہے نا؟‘
’میں سمجھ گیا آنٹی، اور مجھے خوشی ہے کہ آپ اس معاملے میں اتنی سنجیدہ ہیں‘ اتنا کہتے ہوئے اس نے اپنے موبائل پر گھر کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کا اسپیکر آن کر دیا، اور اپنے منھ پر رومال رکھتے ہوئے اا واز بدل کر کشمیری لہجے میں بولا۔
’ہیلو، جی یہ کریم خان صاحب کا گھر ہے؟‘
’جی ہاں آپ کون؟‘
’جی میں کشمیر سے آپ کا ایک خیرخواہ بات کررہا ہوں۔آپ کریم خان صاحب ہی بات کررہے ہیں نا؟‘
’بالکل، فرمایئے، کیا آپ میرے بیٹے کے ہونے والے سسرال سے بات کررہے ہیں؟‘
یہ سن کر صوفی اور اس کی چاچی چونک پڑیں۔نسیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔’جی میں آپ کو یہ اطلاع دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپکے بیٹے پر جادوٹونا کر کے پھانس لیا گیا ہے، آپ کے بیٹے کی ہونے والی بیوی اور اس کی چاچی یہاں کی بہت بدنام عورتیں ہیں۔آپ اگر اپنے گھر کی آبرو اور اپنے خاندان کا وقار بچانہ چاہتے ہیں تو جلد از جلد اپنے بیٹے کو واپس بلالیں۔‘
’آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟‘
’جی میں لڑکی کی چاچی کا رشتہ دار بول رہا ہوں‘
’لعنت ہے آپ پر۔دو مفلس بے سہارا عورتوں۔جن میں میری ہونے والی بہو یتیم اور اس کی چاچی بیوہ ہے، ان کی مدد کرنے کے بجائے آپ ان پر اتنا گھٹیا الزام لگا رہے ہیں۔خبردار! اب آپ نے میری ہونے والی بہو یا میری ہونے والی سمدھن کے بارے میں کچھ بھی بکا تو۔‘

'آپ اتنی دور سے مجھے میری علاقے میں دھمکا رہے ہیں یاد رکھیئے، اگر آپ کے بیٹے نے ان سے رشتہ نہیں توڑا تو وہ یہاں سے زندہ نہ جاسکے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اسے واپس بلالیں'
'علاقہ تو کتوں کا ہوتا ہے صاحب، اور میرا بیٹا شیر ہے۔ کتہ شیر کا شکار نہیں کیا کرتا۔ اور اگر آپ جیسے کچھ کتوں نے مل کر میرے شیر بیٹے کا شکار کرنے کی کوشش کی یا پھر میری بہو اور سمدھن کو کچھ نقصان پہنچانے کی کوشش بھر کی تو یاد رکھیئے گا، میں کریم خان آپ کو زبان دیتا ہوں کہ آپ آسمان سے پار چلے جائیں یا زمین کی تہ میں خود کو دھنسا لیں، میں آپ کو ڈھونڈ نکالوں گا، اور پھر آپ کو یقین کیجیے، اپنے پیدا ہونے پر افسوس ہوگا'
نسیم نے موبائی بند کر دیا اور دونوں کی جانب دیکھا۔ صوفی کی چاچی نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا، وہ کچھ کہنے والی ہی تھی کہ نسیم کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔
'ہیلو! جی ابو جی، اسلام الیکم، جی میں ۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جی میں وہیں ہوں۔ اچھا۔۔ اچھا۔ دیتا ہوں' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل چاچی کی جانب بڑھا دیا۔
'ہیلو اسلام الیکم۔ میں صوفی کی چاچی بول رہی ہوں'
'سمدھن جی میں نسیم کا ابو کریم خان بول رہا ہوں۔ آپ جلد از جلد دونو کی شادی کی تاریخ طئے کیجیے۔ کسی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔
آپ کا اور میری بہو کا کوئی بال بھی بانکا نہیں کرسکتا، لیجیئے آپ کی سمدھن یعنی نسیم کی ماں آپ سے بات کریں گی'
'ہیلو۔ السلام علیکم۔ سمدھن جی جلدی سیمیری بہو کو لیکر میرے پاس آجایئے'
'جی۔۔ جی۔۔' پھر کچھ رسمی باتیں کرنے کے بعد چاچی نے موبائل صوفی کی جانب بڑھا دیا۔
'ہیلو!' السلام علیکم امی'۔
'سلامت رہو میری بچی، اب ن تم سے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ جلدی سے میرے پاس آجاؤ تکہ میں تمہاری ساری بلائیں اپنے سر لے سکوں'
صوفی سے کچھ کہتے نہ بنا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نسیم نے لپک کر موبائل لے لیا۔
'جی امی، اسلام علیکم۔ جی۔ وہ آپکی بات سن کر شائد خوشی سے رونے لگی۔ جی امی۔ جی بہت اچھا'
'اچھا انٹی اب میں چلتا ہوں، کل مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ آپ سے کل وداع لینی آؤں گا'
خوش رہو بیٹے۔ صوفی بیٹی جاؤ۔ نسیم کو سڑک تک چھوڑ کر آؤ'

'کیا بات ہے جان۔تم اداس ہو۔ارے یار تمہاری چاچی جع کہ اب میرے ساس ہوں گی ان کو میں تم سے الگ کر کے یہاں تھوڑی چھوڑ جاؤں گا۔ یہاں وہ اکیلی کس کیسہارے رہیں گی۔وہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی۔'

'یہ بات نہیں ہے۔بات یہ ہے کہ میری تقدیر سے میری خوشی نہیں دیکھی جاتی۔جب میں دس سال کی ہوئی اور اپنے خوشی غم کو محسوس کرنے لگی تو تقدیر نے ایک کار حادثے میں میرے والدین کو چھین لیا۔ ان کی کار دوسری گاڑی سے ٹکرا کر ج دریائے جہلم کے آب میں سما گئی۔ چاچا نے بڑی محبت سے پرورش کی۔جب لگنے لگا کہ اب زندگی خوش حال ہونے والی ہے تو وہ بھی میری چاچی اور مجھے روتا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔وہ کار چلاتے ہوئے آرام سے کشتواڑ تجارت کے سلسلے میں جارہے تھے کہ ایک بے قابو ٹرک نے پیچھے سے کار میں ٹکر ماردی اور وہ کار سمیت اچھلتے دریائے چناب کے آد میں ایسے دفن ہوئے کہ لاش تک نہ مل سکی۔ان کا غائبانہ جنازہ پڑھا گیا۔مجھے اس دن سے ایسا لگتا ہے کہ قدرت کی حسین نعمت آب ہمارا دشمن ہے۔شتہ داروں نے ہماری جائنداد پر قبضہ کرلیا۔اب یہاں جو ہماری تھوڑی سی زمین ہے اور مزدوروں سے کاشت کاری کروا کر چاچی اپنا اور میرا پیٹ بھرتی ہے،وہ اس کے نام تھی جو بچی رہ گئی اور ہماری زندگی کا ذریعہ ہے۔اب جب پھر زندگی میں خوشیاں آنے والی ہیں، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ تقدیر کہیں پھر ہمیں الگ نہ کردے۔' یہ کہہ کر صوفی نہ جانے کیوں اس کے سینے سے لپٹ کر سسکنے لگی۔'

'اس بارے میں میں تم سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں جان کہ موت بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔

اچھا دیکھو۔ میں سمجھتا ہوں۔ابھی جولائی ہے۔یہاں کے اونی گارمنٹس کا آرڈر میں نے دے دیا ہے۔مال کی ڈلیوری لینے میں ستمبر میں پھر آؤں گا،اوراسی وقت میں چاہتا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ لاؤں اور نکاح کر کے تمہیں اور چاچی کو یہاں سے لے جاؤں۔کیوں کہ اس کے بعب ہمارا جڑے کا سیزن شروع ہوجائے گا اور پاپی پیٹ کے لئے مجھے ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کا چکر بھی لگانا پڑے گا۔تم تو جانتی ہو،تمہارے ہونے والے سسر اور تمہارا ہونے والا خاوند چھوتے موتے تاجر ہیں جو پاپی پیٹ کے لئے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔'

'میں تو آپ کو ابھی سے اپنا سرتاج مان لیا ہے میرے جسم وجان کے مالک۔آپکا حکم اور میرا سر۔'

'نہیں میری زندگی۔تمہارا سر اور میرا سینہ،میری آغوش' یہ کہکر اس نے صوفی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا

۔سڑک آ گئی تھی۔آنکھوں میں لاکھوں خواب لئے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔
'ستمبر میں نسیم شادی کی تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ سیلاب آ گیا۔وادی زبردست تباہی کی زد میں آ گئی۔صوفی کی بستی کو سیلاب کا آب اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔کافی دنوں تک ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔سردیاں اپنے شباب پر تھیں۔نسیم لندن میں تھا کہ ایک دن اس کے والد کا فون آیا کہ صوفی اور اس کی چاچی خیریت سے ایک سرکاری ٹینٹ میں ہیں۔اس نمبر پر تم ان سے بات کرلو۔والد کے دئے ہوئے نمبر پر اس نے فون کیا۔

'دیکھا مرے سرتاج میں نے کہا تھا نہ کہ آب ہمارا دشمن ہے۔'

'میری جان، میں نے بھی تو کہا تھا نہ کہ موت بھی ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔میں لندن کا کام جلد از جلد ختم کر کے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔' 'نہیں آپ آرام سے اپنا کام ختم کیجیے۔ہم یہاں آرام سے ہیں۔آپ اپنے پروگرام کے مطابق گرمی میں آیئے گا۔'

وقت گزرتا گیا۔اپنے پروگرام کے مطابق نسیم بہار کے موسم میں وادی آیا۔صوفی کی بستی کے سارے پکے مکانوں کی جگہ اب ٹین شیڈ والے مکانوں نے لے لی تھی۔مزدور کھیتوں میں کاشت کاری کا کام انجام دے رہے تھے۔

'چاچی، آپ لوگ میرے ساتھ چلئے۔نکاح وغیرہ کی جو بھی رسم ہے، اب وہیں ادا ہو گی۔'

'تمہاری محبت سر آنکھوں پر۔لیکن ہماری بھی کچھ تہذیب ہے، ارمان ہیں۔اس سال اور رک جاؤ۔فصل بہت اچھی ہونے کے امکان ہیں۔کچھ پیسے آ جائیں گے تو عزت، آبرو سے بیٹی کی رخصتی کے ساتھ اپنی بھی رخصتی ہو جائے گی۔بیٹا، خدا تمہیں اور نوازے۔تمہارے پاس قسم کی کوئی کمی نہیں۔لیکن بیٹا جو ہمارا سماج ہے، ہماری تہذیب ہے، اس کا بھی تو کچھ حق ہم پر بنتا ہے۔'

نسیم کچھ نہ کہہ سکا۔طئے پایا کہ اگلی عید کے ساتویں روز بارات آئے گی اور پھر سب ساتھ ہی نسیم کے گھر آ جائیں گے۔

لیکن عید کے تیسرے دن سے ہی وادی کے حالات بگڑ گئے۔پتھر بازی، فائرنگ۔اس بار بھی سب سے زیادہ متاثر صوفی کا ہی علاقہ تھا، کیوں کہ حالات اس کے علاقے سے ہی مزید کشیدگی اختیار کر گئے تھے۔کچھ دن تو لگا کہ سب کچھ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن جب دو ہفتے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تو نسیم برداشت نہ کر سکا اور کسی صورت پتھر اور فائرنگ سے بچتے بچاتے اپنی محبت تک پہنچ گیا۔

'آپ کو ایسے وقت میں اپنی جان پر کھیل کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔'

’اپنی جان کے پاس ہی تو آیا ہوں۔ چلو جیسے ہی مناسب موقع ملے یہاں سے نکل چلتے ہیں، اگر اسی طرح ہماری شادی رکتی رہی تو ہمارا بڑھاپہ آ جائے گا اور شادی نہ ہو سکے گی۔ کیوں چاچی آپ کیا کہتی ہیں؟‘

صوفی کا چہرا شرم سے لال ہو گیا۔ چاچی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

’ٹھیک ہے بیٹا۔ یہاں کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ عزت آبرو کا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا ہے تمہاری امانت تمہیں جتنی جلد سونپ دی جائے، میں اتنی جلد اپنے فرض

سے ادا ہو جاؤں۔ تم صوفی کو لیکر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بعد میں تمہارے یہاں آ جاؤں گی۔ ان حالات میں سب کا گھر چھوڑ کر جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ سماج۔۔۔۔۔‘

’پھر سماج۔‘ نسیم اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ’خیر جیسی آپ کی مرضی۔‘

’ایک دن آدھی رات کے بعد دونوں ایک گاڑی میں سوار ہو کر ائرپورٹ کے لئے نکلے۔ ابھی آدھے راستے ہی پہنچے تھے کہ رات کے احتجاجی جلوس نے ان کا راستہ روک لیا۔ انھیں واپس جانے کا حکم ہوا۔ کچھ دور واپس آ کر انھوں نے گاڑی جنگل کے کنارے جھاڑیوں میں چھپا دیا جلوس کے دور جانے کا انتظار کرنے لگے۔ ان سب میں خاصہ وقت صرف ہو گیا۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو انھوں نے اپنا سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے بعد صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد جب وہ دریائے جہلم پر بنے ہوئے ایک پل کے پاس پہنچے، سڑک کے کنارے چھپے ہوئے کچھ لوگ یکا یک نکل آئے اور ان کا راستہ روک لیا۔ ان کی گاڑی جلا دی گئی اور واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ نسیم نے احتجاج کیا تو لوگ مشتعل ہو کر نعرہ بازی کرنے لگے۔ اتنے میں آسمان میں شعلہ اٹھتا دیکھ پولس وہاں آ گئی۔ پولس کو آتا دیکھ کر نسیم صوفی کا ہاتھ پکڑ کر ان کی جانب دوڑا۔ اتنے میں بھیڑ نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ ادھر پولس نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ ان کے درمیان نسیم اور صوفی دریائے جہلم کے کنارے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے خوف زدہ کھڑے تھے۔ صوفی غور سے جہلم کے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ یکا یک صوفی بول پڑی۔ ’میں نے کہا تھا نہ کہ آب ہمارا دشمن ہے۔‘ نسیم نے اسے مزید مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ’میں نے بھی تو کہا تھا نہ کہ موت بھی ہمیں جدا نہ کر سکے گی۔‘

اسی وقت پتہ نہیں کدھر سے گولی باری شروع ہو گئی اور دو گولی نسیم کے جسم میں سما گئی۔ اس سے پہلے کہ صوفی کہ منھ سے چیخ نکل پاتی، کہیں سے ایک پٹرول بم آ کر صوفی کے سر سے ٹکرایا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ بن گئی۔ نسیم نے جلتی صوفی کو گود میں اٹھایا اور دریائے جہلم میں کود گیا۔

# Afsanche افسانچے

Afsanche by Dr. Nazir Mushtaq (MBBS) (Srinagar)cell-9149984865

ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر) cell-9419004094

## Sirr-e-Ilahi سرِ الٰہی

نہانے کے دوران میمونہ نے اپنے بائیں پستان میں ایک اُبھار سا محسوس کیا............اس نے اپنی ساس سے اس بارے میں کہا............ یہ سوچ کر کہ وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لیے کہے۔ساس نے کہا............

"یہ سرِ الٰہی ہوتا ہے کسی سے کہنا نہیں............کل میں تمہیں اپنے پیر کے پاس لے جاؤں گی............"

پیر صاحب نے میمونہ کے پستان کا غور سے معائنہ کیا اور پھر اپنے ہاتھ پستان پر رکھ کر منتر پڑھنے شروع کیے............ یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔پیر صاحب نے اچھی خاصی رقم بھی اینٹھ لی............

چھ ماہ بعد میمونہ کا شوہر اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور مختلف ٹیسٹ لکھے۔

ڈاکٹر نے میمونہ کے شوہر سے کہا............

"بہت دیر ہو چکی ہے سرطانی رسولی کا سائز ۵ سینٹی میٹر سے زیادہ ہو گیا ہے،اس لئے پستان کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔اور پھر ریڈیو کیموتھراپی کے بعد مریض کے بچنے کے امکانات بہت کم ہیں............کاش اپ نے مریض کو سرطان کے پہلے مرحلے میں لایا ہوتا............"

☆☆☆

## Hatdharam ہٹ دھرم

سنجیدہ بیگم بہت خوب صورت شریف تعلیم یافتہ اور ہر کسی کے برے وقت میں کام انے والی عورت تھی............اس کی صرف شوہر دلاور کے ساتھ تو تو میں میں ہوتی تھی اور وہ اکثر اس سے ناراض رہتی............

وہ شوہر کے ساتھ بات چیت بند کرتی مگر اس کا شوہر سیدھا سادہ ادمی ہر وقت اسے

منا تا............وہ کبھی پہل نہیں کرتی............اس روز دونوں میں جھگڑا ہوا تو دونوں میں بات چیت کا سلسلہ بند ہوا۔اس بار دلا ور نے پہل نہیں کی ، وہ اس انتظار میں تھا کہ اس بار اس کی بیوی منانے میں پہل کرے گی............

اچانک دلاور بیمار ہوا............ڈاکٹروں نے جواب دیا۔

سبھی رشتہ دار اس کے ارد گرد بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ کب وہ ہمیشہ کے لئے انکھیں بند کر لے۔ایک رشتہ دار اس کے نزدیک گیا اور اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا... بھائی صاحب میں نے کئی بار اپ کے ساتھ برا سلوک کیا ہے مجھے معاف کرنا............

سنجیدہ بیگم نے یہ سن کر شوہر کے سرہانے بیٹھی اپنی بیٹی سے کہا............میں اج کل اس کے ساتھ بات نہیں کرتی ہوں میری طرف سے ............تو ہی اس سے کہہ دے کہ میری غلطیاں معاف کرے............

☆☆☆

## بلاعنوان Bila Unwaan

میاں بیوی کمرے میں بکھرے سامان کو ترتیب دے رہے تھے............ان کا چھوٹا معصوم بیٹا بھی ان کی مدد کر رہا تھا............مرد مختلف موضوعات پر کتابوں کو الماری کے شیلفوں میں رکھ رہا تھا، اچانک بیٹے نے اس کی طرف قران مجید بڑھایا اور کہا ڈیڈی اس الماری کے سب سے اوپر والے شیلف میں رکھ دیں۔

باپ خوش ہوا کہ بیٹا قران شریف کی عظمت اور حرمت جان چکا ہے۔پھر بھی اس نے بیٹے سے پوچھا۔

کیوں الماری کے اوپر والے شیلف میں کیوں رکھوں............

بیٹے نے بیچ والے شیلف میں کوئی کتاب رکھتے ہوئے جواب دیا............

کیونکہ اسے اپ پڑھتے نہیں............

☆☆☆

## شرمندگی Sharmindagi

وہ سب سر جھکائے ہوئے قبر کے اردگرد فاتحہ خوانی میں مشغول تھے۔ اچانک اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، کسی کے چہرے پر ماسک نہیں تھا، اسے عجیب سی شرمندگی محسوس ہوئی، اس نے جلدی سے اپنے چہرے سے ماسک اتار کر جیب میں ٹھونس دیا اور ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد دوبارہ فاتحہ پڑھنے لگا..

☆☆☆

## سوچ Soch

جیل میں قاتل کو پھانسی دی جانے والی تھی۔

ایک سائنس دان نے جیل حاکم سے کہا کہ وہ انسان کی سوچ پر تحقیق کر رہا ہے، وہ قاتل پر تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے اجازت ملی............

قاتل کو کرسی پر بٹھا کر رسیوں سے باندھا گیا............آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی............قاتل سے کہا گیا کہ پھانسی کی سزا کے بجائے اسے ایک زہریلا کوبرا ڈس لے گا............

سائنس دان نے دو نوکیلی سوئیاں دو بار قاتل کی ٹانگ میں چبھو دیں اور قاتل سے کہا۔ کوبرا نے تمہیں ڈس لیا............

دس منٹ بعد پہلے قاتل کی رسیاں کھول دی گئیں پھر اس کی آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی............

اچانک قاتل کرسی سے گر پڑا............سائنس دان نے اس کی نبض ٹٹولی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"یہ مر چکا ہے۔"

☆☆☆

## خوددار khuddar

خون بیچنے والوں کی لائن میں بلڈ بینک ملازم نے ایک کمزور لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا......
''تم بہت کمزور ہو اپنا خون نہیں دے سکتے''............
لڑکے نے رندھی ہوئی اواز میں کہا............
''سر پلیز۔ چار دن سے بھوکا ہوں''............

☆☆☆

## ترجیح Tarjeeh

''بیٹا۔ ذرا اپنے باپ کو پارک میں لیجا......ذرا سیر کرے گا۔ کووڈ بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا ہے۔ تو اسے سہارا دے اور پارک میں لے جا......اس کا دل بہل جائے گا''

............ ماں نے اپنے بیٹے سے کہا اور خود لاٹھی ٹیکتے ہوئے کچن کی طرف گئی............
بیٹے نے بیمار باپ کی طرف دیکھ کر ناک سکوڑ لی اور سیٹی بجاتے ہوئے گھر سے باہر نکلا اور باہر گیراج کے نزدیک بندھے ہوئے کتے سے مخاطب ہوا۔
''چل ٹومی۔ تو کئی دنوں سے باہر نہیں گیا، چل تجھے سیر کراؤں''............

☆☆☆

Shikar by Syed Baseeul Hasan Wafa Naqvi (Aligarh)
ڈاکٹر سید بصیر الحسن وفاؔ نقوی (علی گڑھ) موبائل:9219782014

# شکار

اس کو ادب پڑھنے کا خصوصاً افسانے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔اس کی نگاہ کئی زبانوں کے ادب پر تھی۔ وہ فرانس کے افسانہ نگار موپاساں کو بہت پسند کرتا تھا۔ جب کبھی کسی ادب کی راہ کے مسافر سے ملاقات کرتا تو موپاساں کی کہانیوں کا ذکر ضرور کرتا۔ وہ ان کہانیوں کے انجام پر خاص طور سے گفتگو کرتا اور سوچتا کہ واقعی ایک اچھا افسانہ نگار کس طرح سے اپنے سماج کو کہانی میں پیش کرنے کا ہنر جانتا ہے۔آج کل اس کو موپاساں کی کہانی ''چھوٹا پیپا'' بار بار پڑھنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ جہاں جاتا موپاساں کی یہ کہانی اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی۔ وہ گھر سے باہر نکلتا تو دیکھتا کہ بازار میں نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جو مختلف انداز میں ''چھوٹا پیپا'' کے کردار ہیں۔ وہ اپنے سماج میں مکار و عیار لوگوں کو دیکھتا تو اسے موپاساں یاد آ جاتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کی پڑوسن اپنے شوہر کو سخت سست سنا رہی تھی۔معلوم ہوا کہ اس کا پڑوسی آج بھی دیر سے خالی ہاتھ گھر لوٹا تھا۔شام ہو گئی تھی لیکن گھر میں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کا پڑوسی نہایت نرمی کے ساتھ کہہ رہا ہے'' مجھے آج بھی کام نہیں ملا ۔۔۔میں کیلا نگر کے چوارہے پر دیر تک بیٹھا رہا لیکن کسی نے میری طرف دیکھا تک نہیں''۔

اچانک ایک فحش گالی فضا میں گونجی جو اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ گالی اس کی پڑوسن کے مزاج کی عکاس تھی۔ وہ اپنے شوہر کو گالی بکتے ہوئے کہہ رہی تھی'' تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔تمہارے دوست نے بتایا کہ تم نے کٹیلے سے حاجی جی کے یہاں سے خریدی۔۔۔اور باقی کی بچی ہوئی جیسے ہی لیکر رسل گنج کی طرف بڑھے تو پولس والے کے لٹھ کی وجہ سے تمہاری جیب میں ٹوٹ گئی''۔

اس کو اس میں کوئی حیرت نہ تھی وہ اکثر اپنے آس پاس ایسے لوگ دیکھتا تھا۔ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے پر ایک ڈاڑھی والا شخص ٹوپی لگائے ہوئے سڑک پر بغیر مصلے

یا چادر کے نماز ادا کر رہا تھا۔ اسے نہ موری سے اٹھنے والے تعفن کی پرواتھی اور نہ اپنے کپڑوں کی جو دھول میں اٹ چکے تھے۔

اسے خیال آیا کہ اسی طرح کے کئی کرداروں کو اس نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کو بھی جانتا تھا کہ جو کبھی مومن بن جاتا تھا اور چہرے پر خط رکھ کر خوفِ خدا سے متعلق باتیں کرتا تھا اور مسجد میں پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ کڑاکے کی سردیوں میں بھی صفِ اول میں صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا اور جب نمازیوں کی تعداد کم دیکھتا تو پیش امام سے مخاطب ہو کر کہتا ''مولانا آپ قوم کو تبلیغ نہیں کرتے۔۔۔ ورنہ نمازِ فجر میں اتنے کم آدمی نہ ہوتے''۔ لیکن اس شخص کا جب مزاج بدلتا تو کلین شیو ہو جاتا اور مہینوں کے لئے مسجد تو کیا مسجد والی گلی سے گزرنا چھوڑ دیتا اور بازار میں اکثر حالتِ غیر میں پایا جاتا۔ کوئی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو سمجھانے کے صلے میں گالیوں کا تحفہ حاصل کرتا۔

ایک دن اس کو کسی کام سے گھر سے باہر جانا پڑا تو اس نے دیکھا کہ گلی کے موڑ پر ایسے مقام پر جہاں سے دوسری طرف سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ چند کمسن اور نوعمر لڑکے اپنے اپنے منہ سے فضا میں دھوئیں کے مرغولے بنا رہے تھے۔ اس نے چلتے چلتے آواز سنی'' آج پاپا بہت ماریں گے''۔ '' کیوں ماریں گے؟؟؟؟ کیا انھیں معلوم ہے کہ تم۔۔۔''۔

جملہ فضا میں ادھورا رہ گیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ بات کیا چل رہی ہے۔ وہ اس لڑکے کو جانتا تھا وہ اس کی اگلی گلی میں رہتا تھا اور اس کے گھر سے اکثر اس کے والد کے چلانے کی آواز آتی تھی'' ایسا کب تک چلے گا؟؟؟۔۔۔ کب تک۔۔۔ گھر کا سامان بیچو گے؟؟؟۔۔۔ یہ سب کرنا ہے تو کچھ کماتے کیوں نہیں؟؟؟ بی ٹیک کس لئے کیا ہے اپنی زندگی تباہ کرنے کے لئے؟؟؟''۔

اسے چلتے چلتے کسی کا کہا ہوا یاد آ گیا'' اگر کسی سے بدلا لینا ہے تو اس کی اولاد کو بگاڑ دو''۔ یہ بات سچ ہے منافقت اسی کو کہتے ہیں کہ دوستی بھی رہے اور دشمنی بھی اپنا پورا کام انجام دے۔ اس نے پچھلے زمانوں کی جنگوں کے بارے میں پڑھا بھی تھا اور سنا بھی تھا لیکن اسے آج کے دور میں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جنگ کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ ایک دن اس کے بائیں جانب کے پڑوسی کا لڑکا اپنی چھت سے اتر کر اس کے آنگن میں آ گیا تھا اور ایک سرنج نکال کر اس سے بولا تھا کہ میرا ہاتھ پکڑنا۔ اس نے ہاتھ پکڑا تو اس نے دیکھا کہ اس نوجوان نے اپنی بانہہ کی پھولی ہوئی نس میں انجیکشن لگا کر ایک

عجیب سا سرور محسوس کیا تھا۔اس کو اس بات کا اندازہ بعد میں ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔اس نے صرف اتنا ہی کہا''آج کے بعد اس طرح میرے گھر میں نہ آنا''۔نوجوان نے اس کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا تھا''چاچا!!!مجھے اگر سانپ بھی کاٹ لے تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا''۔

وہ ایک دن اپنا موڈ فریش کرنے کے لئے دیوار پر لگی بڑی سی اسکرین پر''شرابی'' فلم دیکھ رہا تھا اور اس ڈائلاگ سے محظوظ ہو رہا تھا کہ''مونچھیں ہوں تو نتھو لال جی جیسی ورنہ نہ ہوں''۔اس ڈائلاگ کا اثر اس پر جو بھی ہوا ہو یہ تو وہ جانے لیکن باہر سے گزرنے والے ایک راہگیر نے زور زور سے اس کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص بار بار اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ وہ جذب کے عالم میں ہے۔وہ کبھی اپنے سر کو پیٹتا تو کبھی اپنا چہرہ آگے بڑھا کر اور آنکھیں نکال کر کہتا''یہ دیکھو مونچھیں اسے کہتے ہیں۔۔۔یہ ہے مونچھ۔۔۔یہ ہے مونچھ''۔ابھی وہ کچھ سمجھ پاتا کہ اس بڑی مونچھوں والے شخص نے اپنے بڑے سے کرتے کی جیب سے ایک ماچس کی ڈبیا نکالی اور اس کو کھول کر بولا''دیکھو!!!ایسی ہوتی ہے''۔یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اس نے دیکھا تھا کہ ماچس میں کچھ کالی سی چیز تھی۔

اس نے مجذوبیت میں سرشار کئی لوگ دیکھے تھے۔اچانک اس کے ذہن میں ایک استاد شاعر کی تصویر گردش کرنے لگی۔اسے ایک مشاعرے کا منظر یاد آ گیا جس میں وہ کبھی شرکت کرنے گیا تھا۔جیسے ہی اس نے مشاعرہ گاہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ استاد الشعراء اسٹیج سے نیچے اتر کر حاضرین کے سامنے ٹھمکا لگا رہے تھے۔مائک کے نزدیک ایک شاعرہ نہایت اطمنان سے خاموش کھڑی ہوئی یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ صدر مشاعرہ کو یہ کیا ہو گیا۔وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر دم بخود تھا۔اسے یاد آیا کہ یہ وہی شاعر تھے جنھوں نے غالب کی زمین میں غزلیں کہہ کر دھوم مچا دی تھی ساتھ ہی دنیائے ادب میں ماہرِ عروض کہلاتے تھے اور جس سے چاہتے تھے بھڑ جاتے تھے۔اس نے ایک دن انھیں استاد سے پوچھا تھا کہ کیا شاعری میں اس قیامت خیز سے کچھ فیض ہوتا ہے۔تو انھوں نے تھوڑا خاموش ہو کر ہلکے سے بتایا تھا حقیقت میں شاعری اور اس کا کوئی لینا دینا نہیں لیکن اس کی قربت کے بعد شاعر بے خوف ہو جاتا ہے اور کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔

وہ لکھنے پڑھنے والوں میں ہی نہیں بلکہ رکشہ چلانے والوں میں بھی ایسے کردار دیکھتا تھا جو اسے سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ایک دن وہ امیر نشاں سے گھر لوٹ رہا تھا تو اس نے

دیکھا کہ ایک رکشہ والا اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔حالانکہ وہ کمزور اور دھان پان سا شخص تھا لیکن پھر بھی اس کو رکشے میں بیٹھنے میں اس لئے قباحت نہ ہوئی کہ وہ رکشے والے کی مدد کرنا چاہتا تھا۔رکشہ والا توقع سے زیادہ تیز رفتار تھا۔اس نے کہا'' آہستہ رکشہ چلاؤ۔۔۔تھک جاؤ گے''۔رکشے والے نے جواب دیا''بابو جی!!! میں اور تھک جاؤں۔۔۔یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ابھی۔۔۔ابھی تو جان آئی ہے۔۔۔۔تو اس کا اثر بھی دیکھئے''۔اس نے دیکھا کہ رکشہ والا جیسے جیسے بات کرتا ہے تو بلا تکلف اس کے منہ سے ایک بد بو چھوٹتی ہے۔

گھر آ چکا تھا روپئے دیتے ہوئے اس نے پوچھا'' کب سے کر رہے ہو بھائی؟؟؟''رکشہ والا بغیر سوچے بول پڑا''بیس سال ہو گئے۔۔۔بالک چھوٹے چھوٹے تھے۔۔۔ایک لڑکی بھی بیاہ دی سنبھل میں''۔

''کوئی منع نہیں کرتا کیا؟؟؟۔بچے نہیں روکتے؟؟؟''۔

اس سوال پر رکشہ والا کچھ نہ کہہ کر اتنا بولا''بابو جی اب تو مرنے کے بعد ہی سوچا جائے گا''۔

ایک دن جب بہت دنوں بعد وہ کسی اپنے عزیز کے گھر گیا۔گرمیوں کے دن تھے سورج کا قہر نازل ہو رہا تھا۔اس نے خود کو پسینے میں ڈوبا ہوا دیکھا تو اپنے عزیز سے کہا''کیا بات ہے۔کیا آج گھر میں بجلی نہیں؟؟؟''جواب ملا''بجلی تو کئی دن سے نہیں۔۔۔بجلی والوں نے بل نہ جمع کرنے کی وجہ سے کاٹ دی''۔اس کو حیرت ہوئی کہ اس کے عزیز کی پنشن اتنی بھی کم نہیں کہ بجلی کا بل ادا نہ کیا جا سکے۔اس نے گھر کے ایک کمرے کی طرف غور کیا جس کا دروازہ بند تھا اور سورج بھی اسے اپنی توانائی بھرپور انداز میں دکھا رہا تھا۔اچانک اسے بچپن کی پڑھی ہوئی ایک کہانی یاد آ گئی۔جس میں سورج اور ہوا ایک پہاڑی پر ملتے ہیں اور دونوں ایک مسافر کو دیکھ کر شرط لگاتے ہیں کہ وہی طاقت ور زیادہ ہوگا جو اس مسافر کا کوٹ اتروا دے۔ہوا بہت تیز چلی لیکن کامیاب نہ ہو سکی سورج جب پوری طاقت سے چمکا تو مسافر نے اپنا کوٹ اتار کر ثابت کیا کہ سورج زیادہ طاقت ور ہے۔آج بھی لگتا تھا سورج کسی سے شرط لگائے ہوئے ہے۔وہ خود بھی پسینوں سے شرابور تھا۔اس نے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ اس کے عزیز کا نوجوان لڑکا چادر اوڑھے ہوئے گہری نیند سو رہا ہے۔اس کے منہ پر کچھ مکھیاں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں لیکن وہ ہے کہ اٹھتا ہی نہیں اور دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔معلوم ہوا کہ لڑکا رات بھر شب بیداری کرتا ہے۔یہ ریاضت یا عبادت سے ہم آہنگ شب بیداری نہیں بلکہ ایسی

شب بیداری تھی کہ جس کی صداؤں اور آوازوں کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی رات آنکھوں میں ہی گزارتے تھے۔اس نے دیکھا کہ چند کھانسی کے سیرپ کی خالی بوتلیں اس سونے والے کے پلنگ کے نیچے خاموشی سے پڑی ہوئی مٹی چاٹ رہی تھیں۔

وہ گھر کو لوٹا تو راستے میں اسے ایک ایسا شخص دکھائی دیا جس کے بارے میں سنا تھا کہ یہ اس دن سے سدھر گیا ہے جس دن سے اس کے والد کا انتقال ہوا ہے۔اس نے سنا تھا کہ اس کے والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لائبریری میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے اور اکثر جماعت میں امیرِ جماعت بن کر جاتے تھے۔وہاں وہ لوگوں کو نصیحتیں کرتے اور اسلامی درس دیتے تھے۔ایک دن جب وہ علی گڑھ کی ایک مسجد میں جمعرات کے دن عصر کے وقت چند لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور آخرت پر گفتگو کر رہے تھے۔کسی نے ان کے کان میں آکر بڑے احترام سے کچھ کہا تھا وہ فوراً بغیر کسی تاخیر کے اٹھے تھے اور جمالپور کی بڑی مسجد پہنچے تھے۔جہاں انھوں نے دیکھا تھا کہ ایک نوجوان اپنے سامنے ایک سفید چادر بچھائے ہوئے زور زور سے گریہ کناں تھا ''میرے ابا!!! ہائے میرے ابا!!! ہائے میرے ابا نہیں رہے۔۔۔میرے پاس کفن تک کے پیسے نہیں۔۔۔کیا کروں ؟؟؟ ہے کوئی جو امداد کرے۔۔۔اللہ کے واسطے۔۔۔۔میری مدد کرو۔۔۔مدد کرو''۔لوگ اس نوجوان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔جس کے پاس جیب میں جتنا روپیہ تھا دے رہا تھا۔لیکن جب اس نوجوان نے دیکھا کہ خود اس کے والد اس کی جانب دیکھ رہے ہیں جن کی آنکھوں میں آنسو بھی ہیں تو اس نے اپنی چادر کو سمیٹ لیا تھا اور اگلے روز صبح وہ اپنے والد کی حقیقی موت پر جنازے میں شامل تھا۔

اس نے دیکھا کہ ماضی کے اس نوجوان کے بال پک چکے تھے۔اس کو اس کے والد کی جگہ نوکری مل چکی تھی لیکن اسے اس بات کا یقین اب بھی نہیں تھا کہ وہ تائب ہو چکا تھا۔کیونکہ اسے یاد آیا اس موضوع پر اس نے ایک تجربہ کار بزرگ سے گفتگو کی تھی تو انھوں نے بتایا تھا کہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ گولی مار دی جائے کیونکہ کوئی بھی علاج کارگر نہیں۔

اسے یہ بھی یاد آیا کہ علی گڑھ سے ایک سید کی بارات ضلع گوتم بدھ نگر گئی تھی۔سید صاحب کا اپنا ایک وقار تھا اسی طرح شادی بھی مثالی تھی لیکن کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ سید صاحب تنہا ہیں۔وجہ جو بھی ہو لیکن اندازہ یہ تھا کہ انھیں اپنی زوجہ میں کم دلچسپی تھی اور راتوں کو لڑکھڑا کر چلنے کا زیادہ شوق تھا۔اسے افسوس تو اس وقت ہوا جب وہی سید صاحب شہر کی مشہور جگہ شمشاد

مارکیٹ کی ایک دکان کے سامنے جاروب کشی کرتے ہوئے نظر آئے اور ایک شخص ان سے کرخت آواز میں کہہ رہا تھا'' ٹھیک سے جھاڑ و لگا''۔اورانھوں نے یہ سنتے ہی جھاڑ و دینے کے عمل میں تیزی کر دی تھی۔

اسے ایک دن یہ بھی یاد آیا کہ ایک مرزا صاحب سرسید نگر سے اس کے پڑوس میں بنگالی بابو نامی ایک تانترک سے ملنے آئے تھے۔وہ رو رو کر کہہ رہے تھے کہ'' بابا !!! بابا!!! میرے بچے کو بچا لو۔۔۔کچھ ایسا کرو کہ یہ سدھر جائے''۔انھوں نے بتایا کہ اس کے گھر میں بڑے لڑکے کی شادی ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے ہیں کہ اس کے ناسمجھ لڑکے نے اس کی بہو کا زیور چرالیا اور اسے پھول چوراہے پر صرافہ بازار میں کسی سنار کے یہاں بیچ دیا''۔تانترک نے اپنی میلی کچیلی ٹوپی کو سر سے ایک بار اتارا اور پھر پہن کر کچھ زیرِ لب بڑبڑایا۔پھر پاس ہی رکھی ایک پرانی سی لوہے کی ڈبیا کھول کر اس میں سے دو رنگین پتھر نکال کر لڑکے کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک تھما دیئے اور کچھ دیر ہاتھ اٹھانے کے لئے کہا۔ساتھ ہی پاس رکھے ایک بڑے سے ٹیپ ریکارڈر پر تیز آواز میں ایک پنجابی گانا چلا دیا۔پھر کچھ دیر کے لئے تانترک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر اس کی زیرِ لب بڑبڑاہٹ جاری رہی۔اس نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور لڑکے کے چہرے پر زور سے پھونک مار کر کہا'' بیٹا یہ بتا کون سا ہاتھ بھاری ہو رہا ہے؟؟؟''۔لڑکے نے دھیرے سے کہا'' سیدھا ہاتھ بھاری ہے''۔پھر تانترک نے لڑکے کے والد سے مخاطب ہو کر کہا'' لڑکے پر جادو ہے۔۔۔کسی قریبی رشتے دار نے کرایا ہے۔۔۔وہ جلتا ہے تم لوگوں سے''۔لڑکے کے والد نے کہا'' بابا!!! کون ہے وہ؟؟''۔

''نہیں۔۔۔اس کا نام تو نہیں بتاؤں گا۔۔۔گرو نے منع کیا ہے کہ کبھی کسی کا نام نہ بتانا۔۔۔ہاں پہچان بتاتا ہوں اس کی۔۔۔اس کے بال کھچڑی سے ہیں۔۔۔آدھے سفید اور آدھے کالے۔۔۔لمبا قد ہے۔۔۔رنگ سانولا ہے۔۔۔میں اتارہ کر دوں گا لیکن سات دن تک گدی پر روز آنا پڑے گا۔۔۔اس پر سے سات ہنڈیا اتاری جائیں گی۔۔۔پانچ ہزار روپے لگیں گے''۔

اسے معلوم نہیں تھا تانترک کے یہاں ان صاحب کا آنا جانا کتنے دن رہا لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اکثر جمعرات کی شب میں انھیں بڑی عقیدت کے ساتھ تانترک کی چوکھٹ پر کھڑا ہوا دیکھتا۔

ایک دن وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا موپاساں کی کہانی ''رسی کا ٹکڑا'' پڑھ رہا تھا ۔کہانی مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کا انجام اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا مختلف انسانوں کی صورت ہی نہیں فطرت اور نفسیات بھی مختلف ہوتی ہے اور یہ دنیا قدم قدم پر ایک سبق دیتی ہے۔وہ ابھی خیالات کی وادی میں گردش ہی کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔اس نے کال رسیو کی تو اگلی طرف سے آواز تھی''میں اے ایم یو پراکٹر آفس سے بول رہا ہوں۔۔۔آپ کا لڑکا۔۔۔ممتاز ہاسٹل میں ایک کمرے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔۔۔لڑکوں نے اس کی پٹائی بھی کی ہے اور اس پر ایف آئی آر درج بھی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔اس نے چونکہ آپ کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے تو۔۔۔میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے بتا دوں''۔یہ کہہ کر کال کرنے والے نے کال کاٹ دی تھی۔اسے ایسا لگا کہ آسمان ٹوٹ پڑا یا زمین اس کے پیروں تلے سے سرک گئی۔وہ کرے تو کیا کرے وہ کوئی بڑا آدمی تو تھا نہیں ہاں اتنا ضرور تھا کہ کال کرنے والے سے اس کی ایک بار ملاقات ہوئی تھی جب وہ کنیڈی ہال میں ایک جلسے میں گیا تھا اور باتوں ہی باتوں میں اس نے اپنے ذوق کے بارے میں بتایا تھا۔اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک مصنف بھی ہے۔لیکن اس بات کو بھی عرصہ گزر چکا تھا۔اس نے سوچا کہ پتہ نہیں پراکٹر آفس میں اس کی بات مانی جائے یا نہیں۔اس کی فکر بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک اسے یاد آیا کہ جے این میڈیکل کالج میں ایک پروفیسر سے اس کے اچھے مراسم ہیں اور وہ پراکٹر کو بخوبی جانتے ہیں۔اس نے کچھ سوچ کر انھیں فون ملایا''کیا ڈاکٹر سجاد علی سے بات ہو سکتی ہے؟؟؟؟''۔اگلی طرف سے آواز آئی''ہاں!!! بول رہا ہوں کیا بات ہے؟؟؟؟''۔اس نے سارا ماجراء کہہ سنایا۔ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا''کتنی بار آپ کے بیٹے کو سمجھایا۔۔۔کتنی بار اسے زکر یہ مارکیٹ کی دوا کی دکان پر کھڑے ہونے سے منع کیا۔۔۔اب میں کچھ نہیں کر سکتا''۔

اسے قطعی نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا بھی اسی دنیا کا شکار ہے جس کے کرشمے وہ اکثر دیکھتا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر بھی اس نے اپنے بھاری بھرکم پیروں کو جنبش دی۔کچھ دیر بعد اس نے خود کو پولس چوکی میں پایا اور دیکھا کہ اس کا ہاتھ اچانک جیب کی طرف بڑھ رہا ہے۔

☆☆☆

## پروفیسر شاہینہ رضوی کی کتاب" تجرباتِ زیست" کا اجرا

وارانسی 22، اپریل 2025۔

مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی وارانسی کی سابق صدر شعبہء اردو پروفیسر شاہینہ رضوی کی تازہ ترین کتاب" تجرباتِ زیست" کی رسم اجرا مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونورسٹی کے شعبہء اردو کے لائبریری ہال میں ڈین فیکلٹی آف آرٹ پروفیسر انوراگ کمار کے ہاتھوں عمل میں آئی۔اس موقع پر پروفیسر انوراگ کمار نے کہا کہ عام طور پر سبک دوش ہونے کے بعد لوگ پڑھائی لکھائی کے کام سے دست بردار ہوجاتے ہیں لیکن پروفیسر شاہینہ رضوی نے ابھی بھی خود کو فعال رکھا ہے۔میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ نئی نسل بھی اسی طور خود کو فعال رکھے گی۔

شعبہء ہندی کی ڈاکٹر پریتی جیسوال نے کہا کہ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ میں اس یادگار موقع پر موجود ہوں۔شعبہء اردو کے اساتذہ نے بھی اس کتاب کا پر جوش خیر مقدم کرے ہوئے اردو ادب میں اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ڈاکٹر سید حسین جیلانی نے کہا کہ یہ کتاب پروفیسر شاہینہ رضوی کی نظموں،غزلوں اور افسانوں پر مشتمل ہیں۔یہ شاید بالکل نیا تجربہ ہے کہ جب کلیات کے علاوہ کسی کتاب میں نظمیہ اور نثریہ اصناف کو ایک ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ڈاکٹر محمد جاوید نے کہا کہ ایسا بالکل نہیں لگتا کہ اس کتاب کی ضخامت میں اضافے کے لئے نظموں اور غزلوں کی کم تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں بلکہ اس میں چھان پھٹک اور جانچ پرکھ کے بعد وہ قلیل انتخاب ہے جو بڑے بڑے شعراء کے مزاج کا حصہ رہا ہے۔ڈاکٹر عدیلہ نسیم نے فرمایا کہ شعبہء اردو کے لئے یہ بڑے فخر کا مقام ہے کہ یہ تاریخی کتاب جو نہ صرف اپنے مواد کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ نظمیہ اور نثریہ اصناف کو ایک کتاب میں یکجہ کرنے کا یہ اسلوب امکانات کی کئی راہیں بھی کھولتی ہے،کی رسم اجرا کے ہم عینی شاہد ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف نظمیہ یا غزلیہ یا دونوں کو ملا کر کسی تخلیق کار کے پاس چھان پھٹک کے بعد اتنا مواد نہیں ہوتا کہ وہ ایک کتاب کی ہیت میں تبدیل ہو سکے۔اس کے لئے اسے مزید نظمیں یا غزلیں ہونے تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔پروفیسر شاہینہ رضوی میڈم نے نظم اور نثر پاروں کو یکجہ کر کے ایسے تخلیق کاروں کے سامنے ایک نئی مثال پیش کی ہے جو ان کو اشاعت کے اس طریقہء کار سے بھی واقف کراتی ہے۔اس موقع پر طلباء کی کثیر تعداد بھی موجود تھی۔☆☆☆